# انیسویں صدی کے اواخر میں تہذیبی کشمکش

## اودھ پنچ کے حوالے سے

مقالہ برائے ایم فل


مقالہ نگار

**جمال احمد**

نگراں

**ڈاکٹر مظہر حسین**

**(مظہر مہدی)**



ہندوستانی زبانوں کا مرکز

اسکول آف لنگویج، لٹریچر اینڈ کلچر اسٹڈیز

جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی-۶۷

**۲۰۰۳ء**

# UNNISVI SADI KE AWAKHIR MEIN TAHZIBI KASHMAKASH AWADH PANCH KE HAWALE SE

Dissertation submitted to the Jawaharlal Nehru University
in partial fulfilment of the requirement
for the award of the degree of

MASTER OF PHILOSOPHY

*by*

JAMAL AHMAD

*under the supervision of*

DR. MAZHAR HUSSAIN
(MAZHAR MEHDI)

Centre of Indian Languages
School of Languages, Literature and Culture Studies
Jawaharlal Nehru University
New Delhi - 110067

2003

# JAWAHARLAL NEHRU UNIVERSITY

CENTRE OF INDIAN LANGUAGES

SCHOOL OF LANGUAGE, LITERATURE & CULTURE STUDIES

NEW DELHI - 110067

Dated: 21/07/2003

## DECLARATION

I declare that the material in this Disseration entitled **"UNNISVI SADI KE AWAKHIR MEIN TAHZIBI KASHMAKASH AWADH PANCH KE HAWALE SE"** submitted by me is original research work and has not been presviously submitted for any other Degree of this of any other University/Institution.

Jamal Ahmad

(JAMAL AHMAD)
RESEARCH SCHOLAR

DR. MAZHAR HUSSAIN
(MAZHAR MEHDI)
SUPERVISOR
CIL/SLL & CS/JNU

(Prof. NASEER AHMAD KHAN)
CHAIRPERSON
CIL/SLL & CS/JNU

# فہرست


۱- پیش لفظ

۲- باب اول: ۱

اودھ پنچ پس منظر اور تہذیبی مسلک

۳- باب دوم: ۳۰

اودھ پنچ کے تہذیبی سروکار- منشی سجاد حسین کے حوالے سے

۴- باب سوم: ۶۱

اودھ پنچ کے تہذیبی سروکار دیگر قلم کار کے حوالے سے

۱ اکبر الہ آبادی

۲ پنڈت رتن ناتھ سرشار

۳ مرزا مچھو بیگ ستم ظریف

۴ پنڈت تربھون ناتھ ہجر

۵ نواب سید محمد آزاد

۶ مولوی سید عبدالغفور شہباز

۷ منشی جوالا پرشاد برق

۸ منشی احمد علی شوق

۹ مولوی احمد علی کسمنڈوی

۵- حاصل مطالعہ ۹۵

۶- کتابیات ۱۰۱

# پیش لفظ

زیر نظر مقالہ کا موضوع لکھنؤ کے مشہور اخبار ''اودھ پنچ'' کی ''انیسویں صدی کے اواخر میں تہذیبی کشمکش اودھ پنچ کے حوالے سے'' تحقیقی جائزہ ہے۔ اس اخبار کا ذکر اردو صحافت اور طنز و مزاح کے باب میں بار بار کیا گیا ہے لیکن نوآبادیاتی ہندوستان میں تہذیبی کشمکش کا جو عالم تھا اس کے حوالے سے اس کا ذکر بہت ہی کم ملتا ہے۔ جب کہ ''اودھ پنچ'' میں اہل قلم حضرات نے اپنے مضامین میں دیگر سماجی مسائل کے علاوہ تہذیبی کشمکش کو اجاگر کیا ہے۔ مصنفین نے اپنی کتابوں میں ''اودھ پنچ'' کے طنزیہ و مزاحیہ پہلو کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔ لیکن کسی نے اودھ پنچ میں چھپے ہوئے تہذیبی کشمکش سے متعلق تفصیلی جائزہ نہیں پیش کیا۔ جب کہ کوئی ادبی تاریخ اس کے جائزہ کے بغیر مکمل نہ رہ سکے گی۔ ہر چند اس کا اعتراف کیا گیا کہ اردو طنز و مزاح میں اس اخبار کی حیثیت ایک سنگ میل کی ہے، اردو صحافت کی تاریخ میں بھی اس کا قابل ذکر مقام ہے۔ اردو ادب کے نئے رجحانات میں بھی اس کی خدمات کا دائرہ خاصہ وسیع مانا گیا ہے۔

اردو اردب کے نئے رجحانات میں علی گڑھ تحریک کا حصہ اور حیثیت کا ایک خاص مقام ہے اس لیے کہ اس تحریک نے اردو ادب کو نئی سمتیں دکھائیں اور نئے سہارے دیئے اس نے جدید اردو ادب میں عمل اور ردعمل کا نہایت دور رس سلسلہ شروع کیا۔ جیسا کہ ہمیشہ زندگی کے ہر شعبہ میں جدید رجحانات کے بہاؤ میں بعض قابل قدر قدیم ادبی قدریں مسخ اور متروک ہو جاتی ہیں اس تحریک میں بھی یہی صورت سامنے آئی چنانچہ اس کے ردعمل میں جو ادبی اور سماجی ادارے سامنے آتے ہیں ان میں ''اودھ پنچ'' پیش پیش ہے۔ بادی النظر میں اس اخبار کا مسلک اور مطمح نظر قدامت کی پاسبانی اور پاسداری کہا جا سکتا ہے لیکن اس نے محض اندھا

دھند قدامت کی پرستش نہیں کی جیسے جیسے وقت کے ساتھ ساتھ مغربی تہذیب کی تیز روشنی مدھم پڑنے لگی اودھ پنچ کے روشن کیے ہوئے دیے ہماری قومی تہذیب کے تاریک گوشوں پر روشنی ڈالنے لگے۔ تو اس روشنی میں آنکھوں کو چکا چوند کرنے والی کیفیت نہیں تھی لیکن اس روشنی کے بغیر ہم اپنے قدیم تہذیبی سرمایہ کی حفاظت نہیں کر سکتے، مغربی تہذیب کا یورش اور یلغار کا دور دقت نظر سے دیکھا جائے تو سر سید احمد خاں سے شروع ہوتا ہے اور اس کے آغاز ہی سے اس کا ردعمل اودھ پنچ میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اس لیے اس اخبار کا جائزہ لیے بغیر علی گڑھ تحریک کے پیدا کیے ہوئے رجحانات تشنہ اور خام رہ جاتے ہیں۔

زیر نظر مقالہ میں ان تمام رجحانات کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے جو اودھ پنچ کی فائلوں میں محفوظ ہیں اور جن سے ہندوستان کی نشاۃ ثانیہ کی صراحت اور اہمیت متعین کی جاسکتی ہے۔ اس زاویہ سے جو چیز ابھر کر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ اقبال کے فکر وفن کا ماٰخذ اودھ پنچ ہی کا مسلک ہے۔ اقبال نے جس شدت اور شان سے مغربی تہذیب کے ناقص پہلوؤں کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے اس کا پہلا نمونہ اودھ پنچ کے صفحات میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اگر اس اخبار کا بغور مطالعہ کیا جائے تو اس کی قدامت پسندی، مشرقیت نوازی اور ہندوستانی قدروں سے اپنائیت کا سب سے پہلا نقش اور نشان (مذہبی اداروں کو چھوڑ کر) واضح طور پر نمایاں ہوتا ہے۔

''اودھ پنچ'' کی حیثیت محض ایک اخبار کی نہیں تھی جس میں صرف خبریں ہوتی ہیں بلکہ خبروں سے کہیں زیادہ ہماری تہذیبی زندگی کے نقوش، نغمے اور نظارے اس کے اوراق میں بکھرے ہوئے ہیں۔ اودھ پنچ کی فائلوں سے جو بات سب سے زیادہ نمایاں ہوتی ہے وہ اس کی مشرقیت، ادب میں اس کا مزاحیہ انداز، سماجی مسائل میں اس کا قومی نقطہ نظر، تہذیبی معاملات میں اس کا ہندوستانی کردار اور لسانی امور میں اس کے یہاں مستند زبان اور بیش بہا محاورات کا ذخیرہ ہمارے ادب کا گنج ہائے گرانمایہ ہے۔

اودھ پنچ کی حیثیت محض ایک اخبار کی نہیں تھی بلکہ ادبی تحریکوں، سیاسی مسائل، سماجی گتھیوں کے

اظہار کا موثر ذریعہ تھا۔ اس اخبار کے سیاسی معرکے، اس کے صحافتی جھگڑے اور اس کی ادبی نوک جھونک اور اس کے مزاح کے معیار اور اس کی اساس پر اس کی بنیادی خصوصیت تلاش کی جانی چاہیے۔ اس نقاب کو الٹے بغیر ہم اودھ پنچ کی خدمات کے مطالعہ کا حق ادا نہیں کر سکتے۔ ہم نے اس بکھرے ہوئے مواد کی مدد سے اس کے مسلک کا تعین کرنے کی کوشش کی ہے تا کہ مزاح کے پردوں اور ادب کے پہلوؤں میں اس کے سماجی، تہذیبی اور ادبی محرکات چھپ کر نہ رہ جائیں۔

اودھ پنچ کی خدمات کی کہانی ۱۸۷۷ء سے ۱۹۱۲ء تک ۳۵ برس پر پھیلی ہوئی ہے۔ ہر سال اس اخبار نے بلا ناغہ سیکڑوں تخلیقات، نظم و نثر سے اردو ادب کو مالا مال کیا، یہ ایک ایسا کارنامہ ہے جس کا احاطہ کرنا کٹھن کام ہے۔ زیر بحث موضوع کا حق ادا کرنے کے لیے ہم نے اس مقالہ کو تین ابواب میں تقسیم کیا ہے۔

پہلے باب ''اودھ پنچ: پس منظر اور تہذیبی مسلک'' میں ہم نے ان امور کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے جس سے اودھ پنچ کی اہمیت وافادیت واضح ہو جاتی ہے۔ دوسرا باب ''اودھ پنچ کے تہذیبی سروکار-منشی سجاد حسین کے حوالے سے'' متعلق ہے جس میں منشی سجاد حسین کے وہ تمام مضامین جو سیاسی، سماجی، ادبی وتنقیدی اور تہذیبی زندگی پر مشتمل تھے، ان کا تفصیلی جائزہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ تیسرا باب ''اودھ پنچ کے تہذیبی سروکار: دیگر قلم کار کے حوالے سے'' جن میں نو اہل قلم شامل ہیں، ہر ایک کا فرداً فرداً ذکر کر کے ان کی تخلیقات کے حوالے سے بحث کی ہے جس سے تہذیبی زندگی کی کشمکش واضح ہو جاتی ہے۔ آخر میں حاصل مطالعہ ہے جس میں سارے ابواب کی تلخیص کے ساتھ نتائج کو سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے اور اس کے بعد کتابیات کے ذیل میں مآخذ کی فہرست درج ہے جہاں تک عام کتب کا سوال ہے وہ مجھے آسانی سے دستیاب ہو گئیں البتہ اودھ پنچ کے فائلوں تک رسائی کے لیے رضا لائبریری رامپور، صولت لائبریری رامپور، ابوالکلام آزاد لائبریری علی گڑھ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کی لائبریریوں سے استفادہ کیا ان دانش گاہوں کے منتظمین اور کارکنان نے مختلف انداز سے میری جو علمی اعانت کی وہ میری زندگی کے لیے ایسا خزانہ ہے

جس میں کئی خوشگوار یادیں محفوظ ہیں۔

مقالے کی تیاری میں میرے استادمحترم اورنگراں ڈاکٹر مظہر مہدی صاحب نے مقالے کی ابتدا سے انتہا تک قدم قدم پر میری رہنمائی فرمائی اور مجھے اپنے مفید مشوروں سے نوازا۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مقالے کی تکمیل ان کے مشوروں اور رہنمائی کے بغیر نہیں ہوسکتی تھی۔ میں تہہ دل سے ان کا شکر گزار ہوں۔ اس موقع پر میں اپنے کرم فرماؤں، محسنوں اور رفیقوں کو کیسے بھول سکتا ہوں جنھوں نے ریاکاری اور نمود کے اس زمانے میں بھی اپنے خلوص ومحبت کا ثبوت پیش کیا۔ ان میں مطیع اللہ، عبدالرب، محمد عمر فاروق میرے خصوصی شکریے کے مستحق ہیں۔ انھوں نے اپنے بیش قیمتی اوقات میری نذر کردیئے جن سے میرے کام میں بے حد آسانی پیدا ہوئی۔

جمال احمد

ہندوستانی زبانوں کا مرکز

اسکول آف لینگویج، لٹریچر اینڈ کلچر اسٹڈیز

جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی۔ ۶۷

جولائی ۲۰۰۳ء

# باب اول

## اودھ پنچ پس منظر اور تہذیبی مسلک

## پس منظر (تاریخی)

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کو فرد ہوئے تقریباً بیس سال گذر چکے تھے اب ہندوستان مکمل طور پر سلطنت برطانیہ کے زیر نگیں تھا حکومت کے تخریبی دور کا اختتام اور تعمیری دور کا آغاز ہو چکا تھا۔ مغربی تہذیب مشرقی تہذیب سے گلے مل رہی تھی اور زندگی کے ہر شعبے میں اس نئی تہذیب کی کارفرمائی تھی۔ مغرب کے اخلاقی اور معاشرتی اقدار کے دھارے مشرقی تہذیب وتمدن سے متصادم ہو رہے تھے۔ ایک انقلاب ختم ہو چکا تھا اور دوسرے انقلاب کے لیے فضا تیار تھی۔ یہ انقلاب سیاسی نہیں بلکہ ذہنی تھا، جس نے ہندوستان کے سماج کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ایک طبقہ قدامت پسندوں کا تھا جو کسی بھی حالت میں اپنے صدیوں پرانے کلچر کو چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھے، وہ صرف ابھی تک پرانے نظام کے سختی سے پابند تھے۔ اس کی مخالفت میں ایک لفظ بھی سننا گوارا نہ کرتے تھے اور نئے نظام کو وہ انتہائی ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ وہ اپنے علوم وفنون، اپنے شعائر ورسوم اور اپنے عقائد وخیالات کو سینے سے لگائے کسی غیبی مدد کے طالب تھے۔ دوسرا طبقہ ان لوگوں پر مشتمل تھا جو ''چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی'' کا قائل تھا۔ چنانچہ اس طبقہ نے نہ صرف اس جدید مغربی اثرات کو سب سے زیادہ قبول کیا بلکہ پرانے نظام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی بھی حتی الوسع کوشش کی۔ یہ طبقہ مغربی علوم اور مغربی تہذیب سے اتنا متاثر بلکہ مرعوب تھا کہ وہ اسے بہر صورت اپنانے کی کوشش میں مصروف تھا۔ تیسرا طبقہ وہ تھا جو اعتدال کا راستہ اپنانے کے حق میں تھا اور دونوں تہذیبوں سے استفادہ کر کے ایک نئی مخلوط تہذیب کو وجود میں لانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس طبقے پر ایک طرف قدامت کا رنگ چڑھا ہوا تھا تو دوسری طرف اس نے نئی تہذیب سے بھی خوشہ چینی کی تھی یہ طبقہ پرانے نظام

میں تھوڑی سی اصلاح اور تھوڑی سی ترمیم کا قائل تھا۔

غرض ہندوستان کی تاریخ کے اس دور میں مختلف رجحانات ایک دوسرے سے دست و گریباں تھے۔ اودھ پنچ نے اسی ہنگامی دور میں جنم لیا اس دور میں زندگی کی جتنی تبدیلیاں سیاسی، معاشی، مذہبی، تعلیمی اور ادبی امور میں ظہور پذیر ہوئیں وہ کم و بیش اس اخبار کے صفحات پر دیکھی جاسکتی ہیں۔ ہماری جدوجہد آزادی کی ساری جھلکیاں اردو ادب کا عظیم کارنامہ ہیں۔ اودھ پنچ اس معاملے میں اپنا منفرد مقام رکھتا ہے ادبی انقلاب خاص کر نثر نگاری میں جو تغیر اور تبدیلیاں ہوئیں وہ اودھ پنچ ہی کے دور سے متعلق ہیں۔ صحافتی نقطہ نظر سے اگر ہم جائزہ لیں تو یہی زمانہ اردو صحافت کے عہد زریں کی تمہید ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد سے جتنی تحریکیں بارآور ہوئیں وہ ادب ہی کی آغوش میں پلیں اور بڑھیں۔ اس لیے اس دور کے ادب کو پرکھتے وقت اس کے تنوع تسلسل اور خصوصیت سے اس کے مسلک اور مطمح نظر کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ بقول مہدی افادی اردو ادب کے عناصر خمسہ سرسید احمد خاں، مولانا الطاف حسین حالؔی، شبلی، نذیر احمد اور محمد حسین آزادؔ کا یہی دور تھا لیکن یہ بات بھی توجہ چاہتی ہے کہ یہی دور اودھ پنچ کے نورتنوں کا بھی ہے۔ ان سب کے علاوہ اسی زمانے میں اردو کے کئی ادیبوں اور شاعروں نے اپنی زبان کے علمی و ادبی سرمایہ کو بام عروج پر پہنچایا ہے اور یہ سب ہماری توجہ کے مستحق ہیں۔

''اودھ پنچ'' کا اجراء جنوری ۱۸۷۷ء میں ہوا یعنی ۱۸۵۷ء غدر کے ٹھیک بیس سال بعد اور ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کی تشکیل ہوئی تھی۔ اودھ پنچ کے اجراء سے صرف دو سال قبل سرسید نے ۱۸۷۵ء میں مدرسۃ العلوم کو قائم کیا تھا اس طرح دارالعلوم دیوبند کا قیام ۱۸۶۷ء میں ہوا۔ اردو کے سرکاری زبان بننے کے سلسلے میں ۱۸۳۲ء کا سن تاریخی اہمیت رکھتا ہے، ان تاریخوں کے علاوہ اور کئی اہم واقعات کی تاریخیں مثلاً صحافت کی آزادی، غالب کا انتقال (ان کی نثر کے اثرات کے مطالعہ کے لیے) سرسید کا تہذیب الاخلاق کو جاری کرنا وغیرہ کو پیش کرکے یہ چیز واضح کی جاسکتی ہے کہ اودھ پنچ کے دور میں ان امور کا عمل اور اثر تحریکوں

کی شکلوں میں رونما ہو چلا تھا۔اس طرح اودھ پنچ کا زمانہ تحریکات کا زمانہ تھا اس دور کے سیاسی، معاشی اور تعلیمی حالات کا مختصراً خاکہ پیش کیا جارہا ہے۔ جب کبھی ہندوستان کی جدید زبانوں کے ادب کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو ہم بطور پس منظر مغلیہ دور حکومت کے تہذیبی اور سماجی اثرات کا مطالعہ کرتے ہیں کیونکہ اس حکومت کے زوال کے بعد بھی ہندوستان کو غیر ملکی تہذیب اور کلچر کا سامنا کرنا پڑا تھا۔مغلوں کی حکومت کے اثرات کا تجزیہ پروفیسر رشید احمد صدیقی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمایئے:

''ہندوستان میں مغلیہ سلطنت صرف حکومت نہ تھی وہ عظمت انسانی، تہذیب و شائستگی اور علم وفن کی بیکراں ترقی و اشاعت اور بشارت گیتی نورد کی بھی بازگشت تھی جو عرب سے بلند ہو کر ایشیاء، افریقہ اور یورپ میں بھی گونجی اور جس سے دنیا کا کوئی متمدن خطہ ناآشنا نہ رہا۔ اس لیے ہندوستان کے اخلاقی روایات اور تہذیبی امکانات کو نمو اور تازگی بخشی جو اجتماعی رواداری اور فنون لطیفہ میں پوری ہوتی ہے۔''[1]

لیکن انگریزوں کے ہندوستان میں سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے بعد یہ صورت حال بالکل بدل گئی۔انگریزوں کی اس روش کا مطالعہ اردو شاعروں اور ادیبوں نے نہایت موثر طور پر پیش کیا ہے۔مثلاً مصحفی فرماتے ہیں ؎

ہندوستان کی دولت و حشمت جو کچھ کہ تھی
کافر فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی

مولانا حالی نے بھی انگریزوں کی اس لوٹ مار کو شائستہ لوٹ قرار دیا تھا۔فرماتے ہیں ؎

نہیں خالی ضرر سے وحشیوں کی لوٹ بھی لیکن
حذر اس لوٹ سے جو لوٹ ہے علمی و اخلاقی

---

[1] رشید احمد صدیقی، طنزیات و مضحکات۔ص:۸۹

انگریزوں کی اس لوٹ کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف چند ہی برسوں میں ہندوستان کی حالت ایک دم توڑتے ہوئے انسان کی طرح ہوگئی تھی۔ ہندوستان کی معیشت کی تباہ حالی کا نقشہ اودھ پنچ کے ایڈیٹر منشی سجاد حسین کی تحریر سے لگایئے؟، ذیل میں ان کا ایک مکالمہ درج کرتے ہیں، جس میں اس دور کی معاشی حالت کا نقشہ ہمارے سامنے آجاتا ہے:

فاقہ کش: اے میاں باہر کے غلے ہوت: آتے بھی ہو یا دور سے ٹالے بالے بناتے ہو، یہاں مارے فاقوں کے تراقے کے براحال ہے اب تو آواز دینے کی بھی طاقت نہ رہی ۔

اے چارہ گر آچک کہ دم چارہ گری ہے

غلّہ: آیا، گیا، گھبراؤ نہیں بھائی صاحب اتنی دور سے آنا منھ کا نوالہ نہیں ذری دیر ٹھہرو، دم لو، بس اب مجھے تم آیا ہی سمجھو۔

فاقہ کش: انتظار کرکے اب تو صبر نہیں ہوسکتا، آؤ یا چولھے بھاڑ میں جاؤ ۔

پس از انکہ من نمانم بچہ کار خواہی آمد

غلّہ: اے لو میں چل چکا۔ منھ دھو رکھو۔ اب کچھ فکر نہ کرو (ایک آدھ جگہ آیا اور چکی پکی ہوگیا۔ اونٹ کے منھ میں زیرہ)۔

فاقہ کش: (بستر مرگ پر) اب تک غلہ نہ آیا، اب آیا تو کیا، ہم تو چلے۔ غلہ تو آرہے گا۔ افسوس ہم نہ ہوں گے۔ فاقہ کش دم توڑ کر چل بسا۔

منشی سجاد حسین کا یہ مضمون ایک مکالمہ کی صورت میں اودھ پنچ مطبوعہ ۱۹؍نومبر ۱۸۹۶ء کو شائع ہوا تھا یہ مکالمہ تین حصوں پر مشتمل ہے۔ ہم نے یہاں صرف پہلے حصہ کو درج کیا ہے۔

انگریزوں کی اس لوٹ کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف چند ہی برسوں میں ہندوستان کی حالت بقول سجاد حسین ایک دم توڑتے ہوئے انسان کی ہوگئی تھی۔ چاروں طرف سیاسی افراتفری عام تھی، جس کا نتیجہ یہ ہوا

کہ سارا ملک بدانتظامی کا شکار ہوکر غیر ملکی قوت کو طاقتور بنانے میں سازگار ثابت ہوا۔ انگریزوں کی حکومت کے اثرات کا تفصیلی تجزیہ مشہور مورخ ڈاکٹر تاراچند نے اس طرح کیا ہے:

''لوگ مصیبت اور ذلت میں گرفتار اور زندگی سے بیزار تھے۔ اٹھارویں (انیسویں) صدی کا دور مذاق طبیعت، طرز ادا اور نفس مضمون تینوں کے لحاظ سے گرا ہوا ہے۔ اگرچہ الفاظ کی شوکت ترکیبوں کی ندرت اور تشبیہوں کی صنعت گری نے اس پر ملمع کررکھا ہے۔ کمزور بادشاہوں اور صوبہ داروں کے دربار میں شاعری تصنع، مبالغہ اور جذبات پرستی سے معمور تھی اس زمانے میں سوسائٹی کی جو حالت تھی اس کی تصویر اردو شعراء میں میرؔ نے سوز وگداز کے ساتھ سوداؔ نے ہجو اور طنز کے پیرایہ میں، ناسخؔ اور آتشؔ نے صنعت گری اور جذبات پرستی کے رنگ میں کھینچی ہے۔ بنگالی زبان میں بھرتؔ چندر، رامؔ پرشاد اور ان کے ہم عصروں کی شاعری میں ان ہی رجحانوں کی جھلک نظر آتی ہے۔''[1]

انیسویں صدی کے نصف اول میں انگریزوں کا سیاسی اقتدار ہنوز قائم نہیں ہوا تھا۔ ہندوستانی اپنی تہذیب سے بڑی حد تک مطمئن تھے اور اس میں تبدیلی کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتے تھے۔ ان کو یہ احساس نہیں ہوا تھا کہ ان کا سیاسی انحطاط دراصل ذہنی اور اخلاقی انحطاط کا نتیجہ ہے۔ ان کی مذہبی اور معاشرتی زندگی میں ان کے ادب اور فنون لطیفہ میں حقیقت کی روح کم اور تصنع کا رنگ زیادہ ہوگیا تھا اور مجموعی طور پر ان کی تہذیب اس قدر جامد ہوگئی تھی اور اس میں نشو ونما کی اپنے آپ کو نئے حالات کے مطابق کرنے کی طاقت نہیں رہی تھی۔ دوسرے یہ کہ مغربی تہذیب کے ساتھ نئے زمانے اور نئی زندگی کی جو فرحت بخش جھونکے آتے تھے ان میں اہل ہند کو سیاسی اور معاشی غلامی کی زہریلی ہوا کی بو آتی تھی اور وہ اس سے دور بھاگتے تھے۔ اس سیاسی انقلاب کے علاوہ وہ جو اپنی انحطاط مسلمانوں کی اقتصادی اور تمدنی زندگی میں رونما ہوا وہ اس

---

[1] اہل ہند کی مختصر تاریخ: تاراچند، ص: ۳۹۷

سے بھی زیادہ اہم تھا۔

انیسویں صدی کے وسط تک مغربی فلسفہ اور سائنس کے اثرات کافی پھیل چکے تھے۔ سائنس اور مذہب کی کشمکش شروع ہوچکی تھی۔ عقلیت کی طرف میلان بڑھ رہا تھا اور جس طرح نشاۃ ثانیہ کے بعد یورپ کے لیے کشمکش تھی کہ یا تو مذہب سائنس سے مطابقت پیدا کرے یا پھر دو میں سے کسی ایک کو برتر تسلیم کیا جائے یہی صورت حال ہندوستان کے اس دور بیداری میں نظر آتی ہے۔ اسے چاہے جس پہلو سے دیکھا جائے یہ مسئلہ اہمیت اختیار کرتا جارہا ہے کہ مسلمانوں کی اصلاح کی جو تحریکات چل رہی ہیں وہ اسی طرح چلتی رہیں گی یا انھیں نئے علوم اور نئے شعور کی روشنی میں کسی نئے سانچے میں ڈھالا جائے گا۔ غدر کے بعد اس لیے فضا بہت سازگار ہوئی کیوں کہ غدر نے مادی حیثیت سے مغرب کی برتری کا فیصلہ کردیا اور اس نظام حیات کے وہ نقوش واضح کردیئے جو تقریباً سو سال سے ہندوستان کی افق زندگی پر ابھر رہے تھے۔ غدر نے ہندوستان اور خاص کر مسلمانوں کے اندر چھپی ہوئی عیش پسندی اور کاہلی، انحطاطی کیفیت، نئے حالات کا مقابلہ کرنے سے بچتے رہنے کی عادت کو بہت نمایاں کردیا اور ان کے لیے فیصلہ کن گھڑی آ گئی۔ انھوں نے جو کچھ کھویا اس کے فوری تدارک کی کوئی صورت نہ تھی انسانی شعور ایسے موقع پر کوئی نہ کوئی پہلو ایسا پیدا کرلیتا ہے کہ وہ بدلتے ہوئے حالات میں اپنی جگہ بنا سکے۔ چنانچہ مذہبی فلسفیانہ اور اخلاقی نقطہ نظر سے بھی مسلمانوں اور ہندوؤں کو تغیرات کی بنیادوں کو سمجھنا پڑا جہاں مقابلہ ہوسکتا تھا وہاں مقابلہ کیا۔ جہاں سمجھوتے سے کام چل سکتا تھا وہاں سمجھوتہ ہوا اور جہاں شکست تسلیم کیے بغیر چارہ نہ تھا وہاں ہار قبول کی گئی۔

غرض یہ کہ انیسویں صدی انسانی تہذیب کی ایک ایسی منزل ہے جہاں پہنچ کر پرانا تہذیبی سرمایہ دم توڑ دیتا ہے۔ پرانی روایات، پرانا طرز فکر اور پرانی قدریں وقت کے نئے تقاضوں کے سامنے سرنگوں ہوجاتی ہیں۔ اب کاروان زندگی نئے انداز سے ترتیب دیا جانے لگتا ہے ایک طرف یورپ کا صنعتی انقلاب سماج اور سیاست کی بنیادیں بدل دیتا ہے۔ دوسری طرف سائنس کی ترقی کے ذریعہ زمان و مکان کی پنہائیاں سمٹ

جاتی ہیں اور فرانسیسی انقلاب کے زیر اثر قومیت، آزادی اور جمہوریت کے تصورات عام اور اہم ہوجاتے ہیں۔ علمی ترقی کی رفتار اتنی تیز ہوجاتی ہے کہ بقول سرسید احمد خاں:

''کتاب ابھی پریس میں ہوتی ہے کہ اس کے نظریات بدل جاتے ہیں۔''[۱]

انیسویں صدی کے نصف آخر میں خاص کر ۱۸۵۷ء کے بعد دفعتاً نقشہ بدل گیا۔ ہندوستانیوں کو اپنی بے بسی کے احساس سے ایسا صدمہ پہنچا کہ اس نے ان کے راسخ تصور کو جو وہ اپنی تہذیب سے رکھتے تھے متزلزل کر دیا۔ انگریزی تہذیب کے لیے راہ ہموار ہونے لگی اور سمجھا جانے لگا کہ ان کی تہذیب فرسودہ ہوچکی تھی اور نئے زمانے کی معاشی، سیاسی اور ذہنی تقاضوں کو پورا نہیں کرسکتی۔ اس لیے ان کو انگریزوں سے وہ جدید تہذیب سیکھنی چاہیے جس کی بدولت انھوں نے یہ ترقی اور کامیابی حاصل کی ہے۔ اس طرح انگریزی تہذیب کا ایک دیسی چربہ تیار ہوگیا جس نے رفتہ رفتہ ہندوستانی تہذیب کو پیچھے ہٹا کر اس کی جگہ لینی شروع کی۔ اس دور کے سیاسی، معاشی، تعلیمی حالات کے مطالعہ کے بعد یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اودھ پنچ کا دور اپنے اندر بلا کی تبدیلیوں، شکست و ریخت اور توڑ جوڑ کو لیے ہوئے تھا۔ ایک تہذیب کے زوال کے بعد دوسری تہذیب کے قدم جمانے کا آغاز اسی دور سے ہوا۔ چنانچہ اس دور کا ادب اور صحافت ایک آئینہ ہے جس میں ہم اس دور کی گہما گہمی کو دیکھ سکتے ہیں، خاص کر اودھ پنچ نے اپنے ماحول کی بھرپور ترجمانی کی۔ اپنے دور کے ماحول پر جو تبصرے لکھے گو اس کا انداز مزاحیہ تھا اور اکثر طنز کے تیر اس کے کمان سے نکلتے تھے لیکن اس کا مقصد وہی تھا جو ایک صحت مند ادب اور دیانتدار صحافت کا ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے اودھ پنچ کے ماحول کا اس طرح تجزیہ کیا ہے:

''اودھ پنچ نے جس زمانے میں آنکھیں کھولیں وہ اس کے نمو اور ارتقاء کے لیے بہت مناسب تھا۔ غدر کے ہنگامے نے نہ صرف ایک عظیم الشان سلطنت کی آخری دیوار

---

[۱] مرتبہ نسیم قریشی علی گڑھ تحریک، ص:۴۲

ہی کو گرا دیا بلکہ پرانے تمام کی تمام بنیادوں کو متزلزل کر دیا تھا۔ مغربی علوم، مغربی معاشرت اور مغربی تہذیب کے اثر سے ایک ایسا معاشرتی انقلاب رونما ہوا تھا جس کے باعث سماج دو طبقوں میں تقسیم ہو کر رہ گیا تھا۔ ایک طرف وہ لوگ تھے جو ابھی تک پرانے اقدار کا ساتھ دے رہے تھے اور نئے ماحول اور نئے خیالات سے کوئی ذہنی سمجھوتہ کرنے کو ہرگز تیار نہ تھے۔ ان لوگوں میں قدامت پرست مولویوں اور برہمنوں کا وہ طبقہ خاص طور سے زیادہ مشتعل تھا جس کو پرانے نظام میں ایک خاص مرتبہ حاصل تھا لیکن جو نئے حالات میں تیزی سے نظر انداز ہو رہا تھا۔''[۱]

ایک اور جگہ ڈاکٹر وزیر آغا نے اودھ پنچ کے زمانے کا ذکر اور اس کے کارناموں کا اظہار اس طرح کیا ہے:

''انیسویں صدی کے آخر میں سیاسی بیداری نے دو بڑے ہنگاموں کی صورت میں اظہار پایا۔ پہلا ہنگامہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی۔ دوسرا ہنگامہ تھا ''اودھ پنچ'' یہاں جنگ آزادی قلم سے لڑی گئی۔[۲]

چنانچہ اودھ پنچ جن حالات میں اور جس ماحول میں جاری ہوا وہ ایسے تھے جو اس مزاحیہ اخبار کے لیے سازگار اور معاون ثابت ہوئے۔ اس بات کو ہم اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ اودھ پنچ کا مزاحیہ ادب اپنے دور کی پیداوار تھا جس نے اس زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کا بے باکی سے جائزہ لیا اور حالات و واقعات کی تعبیر و تشریح کی۔ ادب کی جو اہم ذمہ داری ہے کہ وہ تنقید حیات کا کام انجام دے اودھ پنچ نے کما حقہ اس فرض کو پورا کیا۔ ادب کا یہ بھی کام ہے کہ وہ تنقید حیات کے ساتھ مسرت کا فرض بھی انجام دے۔

---

۱ ڈاکٹر وزیر آغا، اردو ادب میں طنز و مزاح، ص: ۹۴

۲ اردو کا پہلا مزاحیہ اخبار، ماہنامہ ''شاہراہ'' دہلی، طنز و مزاح نمبر، ص: ۳۲

ہم دیکھتے ہیں کہ اودھ پنچ اس معاملے میں بھی پورا اترا۔ ڈاکٹر خورشید الاسلام نے اودھ پنچ کے وجود میں آنے کو سماجی حالات ہی کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''سیاست بدلی تو عقائد اور اخلاق میں بھی تزلزل پیدا ہوا۔ شاعری کے موضوعات بھی تبدیل ہوئے اور معاشرت میں وہ تصادم رونما ہوا جو طنز وظرافت کا اصل اصول ہے۔ غدر کے بارہ سال بعد غالب کے خطوط اور نذیر احمد کی مرأۃ العروس شائع ہوئے اور ان کے پانچ سال بعد ۱۸۷۷ء میں اودھ پنچ جاری ہوا۔ اودھ پنچ مشرق مغرب کے تصادم کا پہلا مظہر ہے۔''[۱]

۱۸۳۶ء میں پریس ایکٹ کے مطابق ہندوستانی عوام کو اخبارات نکالنے کی اجازت مل چکی تھی۔ چنانچہ متعدد اخبار نکلنا شروع ہوگئے تھے۔ مثلاً کوہِ نور، اخبار عام (لاہور) اشرف الاخبار (دہلی) کشف الاخبار (بمبئی) روزگار (مدراس) کارنامہ اور اخبار اودھ (لکھنؤ) وغیرہ لیکن یہ تمام اخبار خبروں تک ہی محدود تھے اور ان میں نہ تو کوئی سیاسی بصیرت کا حامل تھا اور نہ ہی کوئی اخبار اس وقت کے معاشرے، ماحول اور سوسائٹی کا ترجمان تھا۔ لیکن ''اودھ پنچ'' ان تمام اخباروں سے مختلف اخبار تھا۔ یکم جنوری ۱۸۷۷ء کو منشی محفوظ علی صاحب کی رائے اور مشورہ سے منشی سجاد حسین نے لکھنؤ سے ''لندن پنچ'' کے نقش قدم پر اودھ پنچ کے نام سے ایک اخبار جاری کر کے حکومت اور نئے نظام کی بے راہ روی اور دوسرے معائب کو طنز وظرافت کا نشانہ بنایا۔ اس کی شہرت کا چرچہ شائع ہوتے ہی ہندوستان کے کونے کونے میں ہونے لگا۔ عوام وخواص نے اس کا خیر مقدم کیا، ہمعصر اخباروں نے نے حقارت کی نظروں سے دیکھا اور نفرت سے منہ پھیر لیا۔ گورنمنٹ نے شک وشبہ سے بھرپور نگاہیں ڈالیں اور مسخرہ سمجھ کر چھوڑ دیا۔ لیکن ان تمام باتوں سے بے پرواہ اپنی دھن میں

---

[۱] بحوالہ نقوش: طنز ومزاح نمبر، فروری، لاہور، ۱۹۵۹ء، ص: ۱۸

مست دیوانہ وار آگے بڑھتے چلا گیا یہاں تک کہ دیگر اخباروں نے بھی خود کو اس رنگ میں رنگنے کی کوشش کی۔ یہی نہیں بلکہ بہت سے اخبار پنچ کا طرۂ امتیازی لگا کر نکلے لیکن اس کی تیز روشنی کے سامنے چراغ کی مانند ٹمٹمانے لگے اور اودھ پنچ اسی آن بان کے ساتھ صحافت کے آسمان پر مہر نیم روز کی مانند جلوہ فگن رہا۔ بالآخر اس کے زوال کا دور شروع ہوا اور نصف النہار پر پہنچا ہوا یہ آفتاب آہستہ آہستہ ڈھلنے لگا۔ ایڈیٹر منشی سجاد حسین کی علالت اور تنگدستی نے زوال کی رفتار کو اور تیز کر دیا اور آخر ۱۹۱۲ء میں منشی سجاد حسین کی زندگی میں ہی یہ آفتاب غروب ہو گیا۔ اگر چہ بے شمار چھوٹے بڑے ستاروں نے اس تاریک فضا کو منور کرنے کی کوشش کی لیکن وہ آنکھیں جو اودھ پنچ کی روشنی کی عادی ہو چکی تھیں شدت سے اس کی کمی محسوس کرنے لگیں۔ آخر حکیم محمد ممتاز حسین عثمانی کو اس کا احساس ہوا اور ۱۹۱۵ء میں انھوں نے اودھ پنچ کو دوبارہ زندہ کرنے کا عزم کیا اور ۱۹۱۶ء میں اودھ پنچ دوبارہ امید کی کرن بن کر چمکا۔ اودھ پنچ کا یہ دور ثانی ہر چند دور اول کی طرح تابناک نہ تھا پھر بھی بحیثیت مجموعی وہ اپنے زمانے کے تمام اخباروں سے ممتاز تھا لیکن اودھ پنچ کی ترقی اور وقعت کا راز بہت کچھ اس کے ایڈیٹر منشی سجاد حسین کی ذات سے وابستہ تھا۔ جب وہ نہ رہے تو اودھ پنچ میں وہ بات نہ رہی۔ اگر چہ حکیم صاحب کی کوششوں نے اسے دوبارہ زندگی تو بخش دی مگر وہ پہلی سی بات پیدا نہ ہو سکی۔ پھر بھی ۱۹۳۳ء تک اس کی حرارت کو باقی رکھا لیکن ان کے انتقال نے ایک بار پھر اودھ پنچ کی اشاعت کے سلسلہ کو منقطع کر دیا۔ حکیم صاحب کے صاحبزادے ظہیر حیدر نے ایک بار پھر اس کے اجراء کی کوشش کی لیکن اودھ پنچ ایک سال تک موت اور زیست کی زبردست کشمکش میں مبتلا رہا۔ مگر اودھ پنچ کا یہ نوجوان ایڈیٹر ناامید نہ ہوا یہ علیحدہ بات ہے کہ اس ایڈیٹر کی زندگی نے بھی وفا نہ کی اور ۱۹۳۴ء میں اس کی زندگی کے ساتھ اودھ پنچ کی زندگی کا بھی کم و بیش پچپن سال کی عمر میں ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا۔ اگر چہ اودھ پنچ اپنے دور ثانی میں کم و بیش انیس سال زندہ رہا لیکن اس میں شک نہیں کہ دور اول کے تقریباً ۳۵ سال ہی اس کی بقا کے ضامن ہیں۔

اودھ پنچ اپنی طرز کا پہلا اخبار تھا جس کی ایک متعین پالیسی، ایک مستقل مقصد اور مسلک تھا۔اس نے صحافت کی عام روش سے ہٹ کر طنز وظرافت کا لب و لہجہ اختیار کیا اور سب سے پہلے نہ صرف اردو صحافت بلکہ اردو ادب میں مغربی طنز ومزاح کو رواج دیا۔ یہ اخبار نہ صرف اردو بلکہ ہندوستان کی ساری زبانوں میں اس وقت قومی اخبار تھا اور قومی خدمت کی غرض سے ہی نکالا گیا تھا یہ انگریزی حکومت کا سخت مخالف، کانگریس کا طرف دار، سرسید اور ان کی تحریک کا دشمن، قومی یک جہتی کا حامی، امن وآشتی کا پیغامبر اور طنز ومزاح کا شاہکار تھا۔ یہ اپنی نوعیت کا وہ پہلا بے باک صحیفہ تھا جس نے انگریزی حکومت کے دبدبہ کا لحاظ نہ کرتے ہوئے ہندوستان میں سب سے پہلے بے باکانہ سیاسی تحریک کی بنیاد ڈالی اور قومی حقوق کے تحفظ کے لیے آواز اٹھائی۔ اودھ پنچ کے نامہ نگاروں کی بے باک نگاری اس زمانے کے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے بڑی ہمت کا کام تھا لیکن طنز وظرافت کے پیرائے نے اس مشکل اور ناخوشگوار کام کو آسان اور خوشگوار بنادیا تھا۔

۱۸۵۷ء میں جب دہلی خاک وخون میں نہارہی تھی تو اس کا پہلا تاثر ہمیں خطوط غالبؔ میں ملتا ہے۔ غالب نے اس پر اپنے دل کے ٹکڑے صفحۂ قرطاس پر اس طرح نمایاں کیے ہیں کہ وہ ہمارے جذبات میں تلاطم وتہلکہ پیدا کردیتے ہیں۔

اس عہد کو نذیر احمد نے ناول کے ذریعہ ہمارے ذہن کو حقیقت کی طرف متوجہ کیا۔اس تہذیبی تصادم کے نتیجے میں اردو ادب میں ابن الوقت کا کردار ہمارے سامنے آتا ہے، یہ کردار مغربی تہذیب کا پروردہ ہے لیکن اس کی پیدائش اسلامی انحطاط کے دور میں ہوئی ہے۔ وہ ہماری قدامت پرستی کے خلاف پہلا ردعمل ہے جو بڑی حد تک انتہا پسندی پر مبنی ہے۔لیکن دراصل یہ نتیجہ ہے اس قدامت پسند ذہن کا جس کا اظہار حجت الاسلام نے کیا ہے۔ حجت الاسلام اور ابن الوقت یہ دو کردار ہماری قومی اور سماجی زندگی کے دو اہم ترین نمونے ہیں۔ دونوں میں طنز اور تنقید کا بڑا سامان ہے۔ انھوں نے نہ صرف مغرب کی ترجمانی ہے بلکہ مشرق

کی خامیوں اور خرابیوں کو بھی ظاہر کیا ہے۔ یہ ایک طرف سید احمد خاں کے فکر وفن کے نشانات ہیں تو دوسری طرف ہماری زندگی کے اس جمود کو توڑتے ہیں جو خود ہمارا اپنا پیدا کردہ تھا۔ دیوبند اور علی گڑھ بھی اس صورت حال کی پیداوار ہیں۔ غالب کے خطوط کا خون نذیر احمد کے پاس جم چکا تھا مگر اس کے ادبی نقوش زیادہ واضح ہو گئے تھے لیکن اس میں وہ ادبی اپیل نہ تھی جو کسی ادب کی عظمت کا ثبوت ہوتی ہے۔ نذیر احمد کے کردار خواہ وہ قومی قرار دیئے جائیں یا مذہبی اور اخلاقی لیکن یہ طنز ومزاح کی رنگینیوں اور رعنائیوں سے خالی ہیں۔

اس خلا کو سب سے پہلے پنچ اخبارات نے پُر کرنے کی کوشش کی ہے اور اردو نثر کے اس رجحان کو نیا رنگ وآہنگ دیا ہے جس کے نقوش خطوط غالب میں اور جس کے کردار نذیر احمد کے یہاں ملتے ہیں ان میں طنز ومزاح کے معیار کے ایک نئے عہد کا آغاز کا پتہ ملتا ہے اس کے افکار سر سید احمد خاں کے فکر وفن سے یکسر متضاد ہیں لیکن قومی ہمدردی اور قومیت کے تصور کا پہلا نقش بھی انہیں میں ملتا ہے۔ ایک طرف یہ قدامت پرستی کا آخری ترجمان ہے اور دوسری طرف قومیت اور آزادی کا پہلا علمبردار ہے۔ اس میں ہماری زندگی کا وہ تضاد آشکار ہو جاتا ہے جس کا ایک قدم مشرق کی طرف ہے اور دوسرا مغرب کی طرف۔

اودھ پنچ قدامت کا پہلا قدم ہے لیکن ادھورا قدم۔ یہ ترقی پسندی کا پہلا میلان ہے لیکن بہت مبہم۔ اودھ پنچ کی فائلوں میں کشمکش، عمل اور ردعمل، شکست وفتح، خواب وخیال اور حقائق کی تعبیر نو یعنی مشرق کی زندگی میں مغربیت کا آغاز اور مغربیت کے میلانات میں مشرق کی یاد کا بہت سا سامان منتشر ہے۔

اودھ پنچ کو یہ تاریخی اہمیت حاصل ہے کہ اس نے جہاں مغرب کی اندھا دھند تقلید کو ہدف طنز بنایا وہاں اپنی معاشرت کے زوال پذیر عناصر کا مضحکہ بھی اڑایا اور یوں فضا کو اعتدال پر لانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

اودھ پنچ میں نظم ونثر دونوں کو فروغ ملا۔ اگرچہ نثر میں پرچے کے اختتام تک پست مزاج ہی پنپتا رہا لیکن نظم میں مزاح اپنی پوری جولانیوں کے ساتھ امڈ آیا اور اکبر الہ آبادی اودھ پنچ میں چھپنے والے تمام مزاحیہ

نظم نگاروں میں سرخیل تھے۔

اودھ پنچ ظرافت کا علمبردار تھا اور ظرافت کے اس بے پناہ آلے نے زندگی کے کسی شعبہ کو اپنے وار سے محفوظ نہ رکھا اور اردو ادب میں اودھ پنچ اپنے قسم کا اولین پرچہ تھا اور اکثر حیثیت سے وہ ظرافت و طنزیات کے رائج الوقت معیار کا بہترین ترجمان تھا۔ اس سلسلے میں بے موقع نہ ہوگا اگر پنڈت برج نراین چکبست کے وہ خیالات پیش کیے جائیں جو گلدستۂ پنچ میں شائع ہوئے ہیں۔ فرماتے ہیں:

''قوموں کے مذاق سلیم نے جو ظرافت کا اعلیٰ معیار قائم کیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے ہم اودھ پنچ کی ظرافت کو بہ حیثیت مجموعی اعلیٰ درجے کی ظرافت نہیں کہہ سکتے۔ لطیف ظرافت اور بذلہ سنجی و تمسخر میں بہت فرق ہے۔ اگر لطیف و پاکیزہ ظرافت کا رنگ دیکھنا ہے تو اردو زبان کے عاشق کو غالب کے خطوں پر نظر ڈالنا چاہیے۔ اودھ پنچ کے ظریفوں کی شوخ و طرار طبیعت کا رنگ دوسرا ہے۔ ان کے قلم سے پھبتیاں ایسی نکلتی ہیں جیسے کمان سے تیر۔ جو مظلوم ان تیروں کا نشانہ ہوتا ہے، روتا ہے اور دیکھنے والے اس کی بے کسی پر روتے ہیں۔ ان کے فقرے دل میں ہلکی سے چٹکی نہیں لیتے ہیں بلکہ نشتر کی طرح تیر چلاتے ہیں۔ اس کا ہنسنا غالب کے زیر لب مسکراہٹ سے الگ ہے یہ خود بھی نہایت بے تکلفی سے قہقہہ لگاتے ہیں اور دوسروں کو بھی قہقہہ لگانے پر مجبور کرتے ہیں۔''[۱]

یہ سب صحیح لیکن اس عہد کو مدنظر رکھیے جب اودھ پنچ عالم وجود میں آیا، اردو کس رنگ میں تھی اردو لکھنے والے کس رنگ میں تھے، وہ فضا کیا تھی، سوسائٹی کا کیا رنگ تھا؟ پنچ پھر پنچ تھا۔ اسپکٹیٹر نہ تھا اور نہ ہوسکتا تھا۔ بہ ایں ہمہ پنچ کے علمبرداروں میں ہر قسم کے لوگ تھے۔ وہ لوگ بھی تھے جو خود قہقہہ لگاتے تھے اور دوسروں کو قہقہہ لگانے پر مجبور کرتے تھے اور ایسے افراد بھی تھے جن کو ایک طرف مسکرانے میں بھی تامل ہوتا تھا

---

۱ مرتب، کشن پرشاد کول، گلدستہ پنچ، ص: ۴۲

لیکن دوسری طرف سننے اور دیکھنے والے ہنستے ہنستے لوٹ جاتے تھے۔ان واقعات اور حالات کو دیکھتے ہوئے جن کے ماتحت اودھ پنچ عالم وجود میں آیا یہ حکم لگانا قرین انصاف ہے کہ اودھ پنچ نے بہ حیثیت مجموعی اچھی اور ہر قسم کی طنز اور ظرافت کا نمونہ پیش کیا۔

اودھ پنچ کا یہ دور بالکل قدرتی تھا۔مغربیت کا سیلاب بڑھتا چلا آرہا تھا۔مشرق کو زوال نصیب ہو چکا تھا۔اس لیے طبائع ہر اس چیز سے بیگانہ یا متنفر تھیں جس میں مشرقی آب و رنگ کی جھلک ہوتی۔ دوسری طرف ہر اس چیز کو قبول کرنے کے لیے آمادہ تھیں جن میں مغرب کی چاشنی ہوتی۔اودھ پنچ نے ایک طرف ان حیثیات سے بغاوت کی جو مشرق کے لیے باعث ننگ اور اس کی تباہی کا موجب تھیں۔ دوسری طرف اس نے اس کورانہ تقلید کے خلاف علم جہاد بلند کیا جس کی بنا پر لوگ دیوانہ وار مغرب کی پذیرائی اور پرستش کررہے تھے۔اس میں شک نہیں بعض مواقع پر مثلاً گلزار نسیم کا مناقشہ ایسا ہے جس کا مذاق سلیم بہ مشکل متحمل ہوسکتا ہے۔ بہ ایں ہمہ محض خسوف وکسوف کی بنا پر مہر و ماہ کو کب تاریک کہا جاسکتا ہے۔

اردو نثر میں طنز و مزاح کے اس عبوری دور کی ایک خصوصیت اس کے اسلوب بیان میں ایک انقلابی تبدیلی کی نمود ہے۔ اودھ پنچ کے لکھنے والوں کے بیباک پیرایہ اظہار میں ''بالواسطہ انداز'' کا فقدان تھا اور بیشتر اوقات یہ محسوس ہوتا تھا کہ اس دور کے طنز و مزاح کا ادبی رنگ زیادہ واضح ہوتا نظر آتا ہے۔ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس دور میں مواد کی بہ نسبت اسلوب پر زیادہ توجہ صرف کی گئی۔شاید اسی لیے اس دور کی طنزیہ و مزاحیہ نگارشات اپنے انداز پیش کش کے حسین و جمیل ہونے کے باوصف ان شوخ رنگوں سے محروم ہیں جو طنز و مزاح کے جدید دور میں نمودار ہوئے۔

اودھ پنچ کی ایک نمایاں خصوصیت کارٹونوں کی اشاعت ہے جہاں الفاظ ساتھ چھوڑ دیتے ہیں وہاں اشارہ کاری خیالات کے اظہار کا ذریعہ بن جاتی ہے۔کارٹونوں کا وجود کچھ تبدیلیوں کے ساتھ اسی بنیاد پر قائم ہے طنز کے تیکھے پن کو مضحکہ خیزی کے پردے میں چھپا کر پیش کرنا کارٹونوں کا اصل مقصد ہے۔ظرافت کے

اس مشکل پہلو سے لوگ نا آشنا تھے لیکن جب اپنے وقت کے مشہور مصور رام بہادرؒ نے سیاسی مسائل پر کارٹونوں کا سلسلہ شروع کیا تو ظرافت کا یہ رنگ لوگوں کو بہت پسند آیا اور اس کی ندرت اور جامعیت نے زیر لب تبسم کی شان بھی پیدا کی اور شوخی و بے باکی کو بھی انگیز کیا۔

---

۱ اقبال اختر، اردو نثر میں ظرافت، ص: ۱۰۸

## پس منظر-ادبی

اودھ پنچ ۱۸۷۷ء سے ۱۹۱۲ء تک نہایت آب و تاب سے اردو ادب کے آسمان پر جگمگاتا رہا۔ اس دور کے اردو ادب کے معیار اور مذاق کا جائزہ لینا اور اس کے ارتقاء پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے اس دور کو دہلویت کا آخری دور قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ اس دور میں ذوقؔ یا غالبؔ یا مومنؔ کے شاگرد ہیں۔ ان میں کچھ اپج تو نہیں ہے البتہ کلام میں صفائی بہت زیادہ ہے۔ داغؔ نے ضرور بانکپن پیدا کر کے اپنی ایک الگ راہ نکالی اور حالیؔ نے جدید شاعری کی بنیاد ڈالی۔[۱]

دلی کی علمی و ادبی خدمات اور صحتمند روایات کے ساتھ اودھ پنچ کے عہد پر دلی کے ادبی دبستان کا اثر سب سے زیادہ ہوا۔ لکھنؤ کے دبستان شاعری کے بارے میں یہ بات تسلیم کی گئی ہے کہ دلی کے اجڑنے کے بعد لکھنؤ آباد ہوا۔ اس بارے میں ابواللیث صدیقی نے اپنی تالیف ''لکھنؤ کا دبستان شاعری'' میں تفصیل سے اس دبستان کی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ:

> ''جرأتؔ، انشاؔ، مصحفیؔ اور رنگینؔ کی شاعری کی ابتدا دہلی سے ہوئی مگر ان سب کا عروج لکھنؤ ہی میں ہوا۔ ان لوگوں نے زبان کی اصلاح کی، محاورے کو درست کیا، نئی بدشیں، اور نئی ترکیبیں ایجاد کیں اور زبان و بیان میں لطافت و نزاکت پیدا کی۔ مضامین میں ایجادات سے کام لیا اور شاعری کو نیا آب و رنگ بخشا۔''[۲]

دبستان دہلی اور دبستان لکھنؤ کی ادبی خدمات اودھ پنچ کے عہد کے لیے ایک قیمتی ورثہ ہیں جس کے

---

۱ نورالحسن ہاشمی، دلی کا دبستان شاعری، ص: ۸۸

۲ ابواللیث صدیقی، لکھنؤ کا دبستان شاعری، ص: ۲۵

اثرات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ تاہم اودھ پنچ کے دور کا ادب نئے رجحانات اور نئے ماحول کا پروردہ تھا جس کی تفصیل یہ ہے:

''۱۸۵۷ء کا غدر اپنے جلو میں جہاں سیاسی سماجی اور تہذیبی تبدیلیوں کو رکھتا ہے وہیں اس کے گہرے اثرات ادب اور شاعری پر بھی ہوئے۔ لوگوں میں اس بات کا شعور پیدا ہوا کہ وہ اپنی بدلتی ہوئی زندگی کا جائزہ لیں۔ اس سماجی شعور کا بھرپور اظہار کریں۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کے ادب میں ہر جگہ نظر آتا ہے کہ اس دور میں فکری اعتبار سے دو مکتب خیال پیدا ہوگئے تھے۔ پہلا مکتب فکر سرسید احمد خاں اور ان کے رفقاء پر مشتمل تھا۔ اس مکتب فکر کو اردو کا اصلاحی دور بھی قرار دیا جاتا ہے۔ پنڈت کشن پرشاد کول نے اس بات کو اس طرح بیان کیا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد سے جب اردو زبان نے نیا چولا بدلا تو وہاں سرسید احمد خاں اور ان کے رفیقوں نے جن میں حالؔی، شبلؔی، نذیر احمد، مولانا محمد حسین آزؔاد اور ذکاء اللہ شریک تھے نئے ادب کی بنیاد ڈالی اور اردو میں ایک سادہ سلیس اور زمانے کے مطابق سنجیدہ اور متین طرز کو رواج دیا۔''[۱]

۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد جب سنجیدہ ادب یا اصلاحی ادب کا خوب چرچا ہوا تو اس متین طرز کے جواب میں مزاحیہ ادب نے فروغ پایا اس طرح یہ دو نمونے کے انداز بیان عالم وجود میں آئے۔ یہ دونوں اپنے اپنے مطلب اور منشاء کے لحاظ سے ایک ہوتے ہوئے بھی اکثر ایک دوسرے سے بہت دور ہیں۔ تاہم اس دور کا ادب ان دونوں مکاتب فکر کی وجہ متنوع اور موثر بن گیا تھا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد کا اردو ادب جو اودھ پنچ کے دور سے متعلق ہے کن حالات اور کن اصولوں کے ماتحت تشکیل پایا۔ اس بارے میں ڈاکٹر سید عابد حسین کا خیال ہے کہ:

---

[۱] کشن پرشاد کول، ادبی اور قومی تذکرے، جلد: اول، ص: ۵

''ادب میں طرز ادا کی تبدیلی اگر وہ خلوص پر مبنی ہو دراصل وضع نفسی اور فلسفہ حیات کی تبدیلی کا آئینہ ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ اردو اور ہندوستان کی دوسری زبانوں کا حقیقت نگاری کی طرف رجحان دراصل عکس تھا ایک ذہنی انقلاب کا جس میں ہندوستانیوں کی توجہ کا مرکز موضوع کی بجائے معروض کو تصور کے بجائے مشاہدے کو بنا دیا تھا یعنی اسے عہد وسطیٰ سے عہد جدید میں پہنچا دیا تھا۔''[۱]

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد زمانے نے دو تہذیبوں کو ٹکراتے دیکھا تھا۔ عوام اس شش و پنج میں مبتلا تھے کہ کس کا ساتھ دیں۔ ایک طرف تو طرز کہن تھا اور دوسری طرف آئین نو۔ اس کشمکش کا اظہار اس دور کے ادب میں ہمیں اکثر جگہ نظر آتا ہے۔ ایسا ادب بھی وافر مقدار میں ہے جو طرز کہن کی تائید میں لکھا گیا ہے اور جدیدیت کو ملک و قوم کے لیے مضر رساں بتلایا۔ اس طرح ایسا ادب بھی تخلیق ہوا جس نے قوم کو یہ سکھایا کہ ''چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی'' اس طرح جدید اردو ادب جس کو دوسرے الفاظ میں اردو کا اصلاحی ادب قرار دیا جاتا ہے اس دور کی پیداوار ہے جو دراصل مغربی اثرات کا نتیجہ ہے۔

ادب کی اس اصلاحی تحریک کی سب سے نمایاں شخصیت سرسید احمد خاں کی تھی جن کی رہنمائی میں یہ ادب پروان چڑھا۔ علامہ شبلی ایک مضمون میں سرسید احمد خاں کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سرسید کے جس قدر کارنامے ہیں اگرچہ ان میں رفارمیشن اور اصلاح کی حیثیت ہر جگہ نظر آتی ہے لیکن جو چیزیں خصوصیت سے ان کی اصلاح کی بدولت ذرہ سے آفتاب بن گئیں ان میں ایک اردو لٹریچر بھی ہے۔ سرسید ہی کی بدولت اردو اس قابل ہوئی کہ عشق اور عاشقی کے دائرہ سے نکل کر ملکی اور سیاسی، اخلاقی، تاریخی ہر قسم کے مضامین اس زور اور اثر و جامعیت سادگی وصفائی سے ادا کر سکتی ہے کہ اس کی استاد یعنی فارسی زبان کو

---

[۱] سید عابد حسین، قومی تہذیب کا مسئلہ، ص:۲۱۹

یہ بات آج تک نصیب نہ ہوئی۔''[۱]

سرسید اور ان کے رفقاء کا یہ زمانہ مہدی افادی کے نزدیک ''اردو ادب کے عناصر خمسہ'' کا زمانہ ہے۔ اس کے مقابلہ میں کشن پرشاد کول کے نزدیک یہ دور اودھ پنچ کے نورتنوں کا دور ہے۔ اس بات کو ڈاکٹر خورشید الاسلام نے اس طرح بیان کیا ہے:

''ہمارے ادب میں بالخصوص نثر میں طنز وظرافت کی روایت پرانی نہیں اس کی وجہ ظاہر ہے ہمارا ادب بھی کچھ ایسا پرانا نہیں۔ اردو نثر نے فنی شرائط کے ساتھ انیسویں صدی کے آغاز میں جنم لیا، اس کا جنم ہنگامی دور میں ہوا لیکن اس کے جنم دینے والے وہ لوگ تھے جو مہ ونغمہ کو اندوہ و ربا کہتے تھے۔ ان کے خیالات اور جذبات میں قدیم معاشرت کی آسودگی تھی۔ زمانہ واقعیت، تجزیہ استدلال کا تھا، مغرب کا اثر غیر شعوری طور پر زندگی کے ہر گوشہ پر پڑ رہا تھا لیکن چونکہ ابھی تک قدیم و جدید متوازی چل رہے تھے اس لیے نثر بھی قدیم و جدید کے دام میں گرفتار رہی جس کی بہترین مثال باغ و بہار اور فسانہ عجائب ہیں۔ لیکن آہستہ آہستہ مغرب کا اثر دل و دماغ تک پہنچ گیا۔ سیاست بدلی تو عقائد اور اخلاق میں بھی تنزل پیدا ہوا، شاعری کے موضوعات بھی تبدیل ہوئے اور معاشرے کے اندرون میں وہ تصادم رونما ہوا جو طنز وظرافت کا اصل الاصول ہے۔ غدر کے بارہ سال بعد غالب کے خطوط اور نذیر احمد کی ''مرأۃ العروس'' شائع ہوئے اور ان کے پانچ سال بعد ۱۸۷۷ء میں اودھ پنچ جاری ہوا۔ اودھ پنچ میں مشرق ومغرب کے تصادم کا پہلا مظہر ہے۔''[۲]

اس دور کے ادبی سرمایہ کو جو چیزیں مستقل حیثیت عطا کرتی ہیں اور اس کو ایک طرح کی انفرادیت

---

۱ مرتبہ احتشام الدین، بحوالہ ادب پارے، ص: ۱۲۰

۲ عبدالسلام خورشید، طنز وظرافت، رسالہ نقوش، لاہور، ص: ۱۷، ۱۸

بخشتی ہیں ان کو مختصر طور پر اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ اردو ادب میں ۱۸۵۷ء کے بعد کا ادب ایسا ادب ہے جس میں فکر و نظر میں روایت کی تقلید سے ہٹ کر آزادیٔ رائے اور آزادیٔ خیال کا احساس پیدا ہوا اور ایسے مکتب فکر کی بنیاد پڑی جس کے عقائد میں نیچر تہذیب اور مادی ترقی کو بنیادی حیثیت حاصل ہوئی۔ کہنے کو تو یہ چند معمولی الفاظ ہیں مگر انھی چند سادہ لفظوں میں اس زمانے کی مشرق و مغرب کی اکثر و بیشتر ذہنی آویزشوں اور کشمکشوں کی طویل سرگذشتیں محفوظ ہیں۔

بہر حال یہ واضح ہوتا ہے کہ اس دور میں آزادانہ سوچنے اور سائنسی نقطہ نظر سے دیکھنے اور پرکھنے کا میلان پیدا ہوا اس دور کے ادب کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ روایت شکنی کی طرف میلان زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ تاہم اس کے ردعمل کے طور پر ایسا ادب بھی موجود تھا جو فکری اور علمی باتوں میں کورانہ نظر آتا ہے اس دور کے اکثر لکھنے والے گو قدیم اسالیب کی پیروی کو ضروری خیال نہیں کرتے لیکن ان سب کا مزاج اور ساخت کلاسیکی ہے۔ لیکن ایسی کلاسیکی نہیں ہے جس میں ضابطہ پسندی ہی سب کچھ قرار دی جاتی ہو اس طرح اس دور کے ادب میں عقلی توازن، مصلحت اور اجتماعیت کو نمایاں اہمیت حاصل ہوئی ان باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس دور کے ادب میں عقلیت زیادہ ہے اور افسانویت کم ہے ادب میں مقصد نگاری کی انتہا ہونے کی وجہ سے جذبات کا اظہار اتنا نہیں ہوا جتنا عقل کو چھا جانے کا موقع ملا لیکن عقل کی کارفرمائی میں ہمواری نظم، سلیقہ توازن ترتیب اور اعتدال پایا جاتا ہے۔ اردو ادب پر اس دور کا اہم احسان یہ ہے کہ ادب میں جو کہنگی فرسودگی تعطل اور جمود پیدا ہوگیا تھا اس کو ان جدید تصنیفی سرگرمیوں نے بالکل دور کردیا۔

TH-1122

## اودھ پنچ کا تہذیبی مسلک

اودھ پنچ کے تہذیبی مسلک کے تعلق سے بہت سے نقادوں نے اپنی رائے پیش کی ہے۔ اودھ پنچ کے سب سے اہم نقاد پنڈت برج نرائن چکبست نے اس اخبار کے تہذیبی مسلک پر یہ خیال ظاہر کیا ہے:

''اودھ پنچ گو کہ ظرافت کا پرچہ تھا مگر پولیٹکل اور سوشل معرکہ آرائیوں سے بے خبر نہ تھا اس کا مستقل شوسل اور پولیٹکل مسلک تھا اس صوبہ میں ہندوستانی کانگریس کا چراغ سمجھا جاتا تھا مگر جن گوشوں میں اس چراغ کی روشنی کا گذر نہ تھا وہاں اودھ پنچ کی بجلی چکاچوند پیدا کرتی تھی۔ سوشل اصلاح کے معاملہ میں اودھ پنچ لکیر کا فقیر تھا نئی روشنی کے نادان دوستوں کی حماقت کا پردہ فاش کرنے کے علاوہ اس کی ذات سے اس تحریک کو کوئی نفع نہیں پہنچا۔''[۱]

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اودھ پنچ کے تہذیبی مسلک کا جائزہ اس طرح پیش کیا ہے:

''پنچ کا یہ دور بالکل قدرتی تھا، مغربیت کا سیلاب بڑھتا چلا آرہا تھا مشرق کا زوال نصیب ہو چکا تھا۔ اس لیے طبائع ہر اس چیز سے بیگانہ یا متنفر تھیں جس میں مشرقی آب و رنگ کی جھلک ہوتی۔ دوسری طرف ہر اس چیز کو قبول کرنے کے لیے آمادہ تھیں جن میں مغرب کی چاشنی ہوتی۔ پنچ نے ایک طرف ان خیالات سے بغاوت کی جو مشرق کے لیے باعث ننگ اور اس کی تباہی کا موجب تھیں دوسری طرف اس نے اس کورانہ تقلید کے خلاف علم جہاد بلند کیا جس کی بنا پر لوگ دیوانہ وار مغرب کی پذیرائی اور پرستش کر رہے تھے۔''[۲]

اکبر الہ آبادی نے اودھ پنچ کی پالیسی، مسلک، طرز تحریر اور مقصد اشاعت کا منظوم تعارف اودھ پنچ

---

۱ مضامین چکبست، پنڈت برج نرائن چکبست، ص: ۲۷

۲ رشید احمد صدیقی، طنزیات و مضحکات، ص: ۷۸

کے صفحات پر کیا ہے۔ اس منظوم تعارف کے دو شعر یہ ہیں۔

کیوں کر نہ ہو دعائے اعجاز
کھولے ہیں قفس میں بال پرواز
کی سیر دو عالم اک نفس میں
پھر دیکھئے تو اس قفس میں[1]

ایڈیٹر اودھ پنچ انڈین نیشنل کانگریس کے ممبر تھے اور آخر دم تک ممبر رہے اس دور میں اودھ پنچ کی پالیسی کے نمایاں نقوش یہ تھے:

(الف) ہندو مسلم اتحاد اور انڈین نیشنل کانگریس کی حمایت

(ب) حکمراں طبقے پر بے باکانہ نکتہ چینی جس میں نہ صرف انگریزوں کی حکومت بلکہ ریاستی حکمراں بھی شامل تھے۔

(ج) مغربی تہذیب کی مخالفت اور مشرقی اقدار کی علمبرداری۔[2]

اودھ پنچ نے غیر ملکی حکومت کے ظلم و استبداد کے خلاف ادبی انداز سے جہاں خبر لی ہے وہیں اس نے ہندوستانی عوام اور ان کے رہنماؤں پر بھی کڑی نظر رکھی، خاص کر اس کے طنز کا نشانہ سرسید کے افکار پر رہتا تھا۔ سرسید نے تہذیب اور شائستگی کا ہمیشہ ذکر کیا اور اکثر موافقت زمانہ کی تلقین کرتے اور اپنے اہل مذہب کو تہذیب اور شائستگی کے لیے اکساتے تھے اودھ پنچ نے موافقت زمانہ کا مضحکہ اڑایا اور لکھا:

''.....اس مقولہ کی تہذیب بھی بڑھ گئی ہے یعنی زمانے کی موافقت یوں کرو کہ اگر کوئی کہہ دے کہ کوا کان لے جاتا ہے تو کوے کے پیچھے دوڑو اور کان کو نہ ٹٹولو۔ یہاں تک کہ کوے کو گرفتار کرلو، اس کی تلاشی لو، جب کان نہ ملے تو تب اور جگہ ڈھونڈو۔ جب

---

[1] کلیات اکبر، جلد: اول، ص ۱۸۶

[2] عبدالسلام خورشید، صحافت پاکستان و ہند میں، ص: ۲۲

کہیں پتہ نہ لگے اپنے کان کو ٹٹولو اور پھر اشتہار جاری کرو کہ تجربہ سے معلوم ہوا کہ کان کے واسطے کوے کے پیچھے دوڑنا فضول ہے، پہلے اپنے کان ٹٹولو بعد اس کے دوڑو، اس پر تمام دنیا میں تعریف ہو کہ سبحان اللہ کیا حکیمانہ خیالات ہیں دیکھئے کیا اچھا تجربہ ہاتھ آیا۔''[1]

اس مضمون میں سرسید کا نام لیے بغیر ان کا مضحکہ اڑایا گیا ہے کہ وہ برطانوی حکومت کے مصالح کو پیش نظر رکھ کر کبھی ترکوں کو طاقتور قرار دیتے ہیں اور کبھی کمزور اور کبھی ان کے انتظامات ملکی پر تنقید کرتے ہیں اور اپنے اس بیان کی تائید میں میجر فلاں یا کرنل فلاں کے بیانات کو سند کے طور پر پیش کرتے ہیں اودھ پنچ نے اپنے طنز کے لیے مختلف اسلوب بیان سے کام لیا ہے۔

اقلیدس کے ہندسیہ مسئلوں کو پیش نظر رکھ کر ایک نامہ نگار نے اس کی پیروی کی ہے۔ اس کی وجہ جہاں طنز کا وار چھپ کر کیا جاسکا وہیں پر ادبی انداز بیان کی وجہ سے اس میں حسن پیدا ہوسکا اودھ پنچ کا اقلیدس مسئلہ ملاحظہ ہو اس کا عنوان اودھ پنچ کی ''پولیٹیکل اقلیدس'' رکھا ہے۔ پہلے اس مسئلہ کے حدود متعین کیے ہیں یعنی سول سروس وہ میوہ ہے جو سفید رنگ کے لیے مخصوص ہے جس کا سر چھوٹا اور کم وزن ہو وہ دیسی ہے۔

پھر اصول موضوعہ اور علوم متعارفہ کا تعین کیا گیا ہے پھر اس کے بعد شکل اول عملی اس طرح پیش کی گئی ہے:

''دعویٰ، دیسیوں کو باوجود ذی علم اور لائق ہونے کے ذلیل کرو

عمل: ایک قاعدہ مقرر کرو کہ سول سروس کے امتحان کے واسطے بائیس سال کی جگہ انیس برس کی قید لگائی جائے، دیسیوں کو سول سروس بنا کوئی معزز عہدہ نہ دیا جائے جو رائے دیں اس پر تحقیر کے ساتھ مضحکہ ہو پس ہندوستانیوں کی ذلت ہوگی۔

ثبوت: دیسی بوجہ نقص طریقہ تعلیم سرکاری انیس سال کے سن تک سول سروس کا

---

[1] عبدالرزاق فاروقی، بحوالہ اودھ پنچ کی ادبی خدمات، مطبوعہ ۳۱ر جولائی ۱۸۷۷ء

امتحان دینے کی کامل لیاقت نہیں رکھتے اور سول سروس کے میوہ کو ہندوستان کی آب و ہوا موافق نہیں لہٰذا ولایتیوں کے واسطے مخصوص ہے چونکہ دیسیوں کا کم وزن ہوتا ہے اور کم وزن اور چھوٹا سر حماقت کی نشانی ہے لہٰذا دیسی احمق ہیں اس واسطے دیسیوں کی رائے قابل مضحکہ ہے اور مضحکہ چونکہ ذلیل کرتا ہے اس لیے دیسی ذلیل ہو گئے۔''[۱]

اودھ پنچ کے تمام رتن یہی چاہتے تھے کہ انگریزوں کے تمام تہذیبی عناصر کا مضحکہ اڑایا جائے۔ ان کی یہ جو ذہنیت تھی کہ زیادہ سے زیادہ اعلیٰ عہدے انگریزوں کو دئے جائیں اس پر مندرجہ بالا ''سیاسی اقلیدس'' میں بے باک شکایت کی گئی ہے۔ اس طرح انگریزوں کو اپنے جمہوری نظام مملکت کا بڑا غرہ تھا اور یہ بتلاتے تھے کہ جمہوری نظام یا پارلیمانی نظام حکومت کو چلانے کے لیے ایک خاص اہلیت کی ضرورت ہے یہ چیز ہندوستانیوں کو میسر نہیں اس لحاظ سے وہ پارلیمانی طرز حکومت یا اس وضع کی حکومت مقامی کو نہیں چلا سکتے۔ ظاہر ہے یہ خیال ہندوستانیوں کی صریح توہین تھے اور توہین کا جواب نواب سید محمد آزاد نے اپنے ''ڈکشنری'' میں اس طرح دیا تھا۔ انھوں نے لفظ پارلیامنٹ کی تشریح اس طرح کی ہے:

''پارلیامنٹ: مدبروں کا آشیانہ، فصحا اور بلغا کی پرورش کا زچہ خانہ کسی ملک کے قابل لوگوں کی قوت گویائی کا تھیٹر۔''[۲]

اودھ پنچ کی یہ پالیسی تھی کہ وہ ہندوستانیوں کو ایسے کام کرنے سے روکنا چاہتا تھا جن میں ان کا وقار، جان و مال، تہذیب و ادب، خاص کر مذہب متاثر ہوتے ہوں۔ اس کے نامہ نگاروں کی نگاہ بڑی دور رس تھی۔ بعض مورخین نے انگریزی دور حکومت کی نعمتوں کا بڑے خلوص سے ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ انگریزوں نے جہاں بیسیوں اصلاحات کیے اور کئی ایجادات سے یہاں سہولتیں پہنچائیں وہیں پر عدالت کے نئے نظام کی

---

۱ عبدالرزاق فاروقی، بحوالہ اودھ پنچ کی ادبی خدمات، مطبوعہ ۲۸ راگست ۱۸۷۷ء

۲ نئے سال کی نئی روشنی کی نئی ڈکشنری: نواب سید محمد آزاد، بحوالہ اردو ادب میں طنز و مزاح: ڈاکٹر وزیر آغا، ص: ۱۸۲

تشکیل بھی کی۔ شرع اور شاستر کی روشنی میں فیصلہ کرنے والا نظام عدل ختم کر دیا گیا اور اس کی جگہ وکیلوں، بیرسٹروں اور عدالت کے رشوت خور کلرکوں کا نظام عدل نافذ کیا گیا۔ اودھ پنچ نے اس نظام عدل کی تہہ میں پہنچ کر وہاں بھی دکھتی رگ پر اپنا ہاتھ رکھا اور بتلایا کہ نئے نظام نے عوام کو مقدمہ بازی کے شوق کا چسکہ لگا دیا ہے۔ ورنہ ہمارے ملک میں عدالت جانا یا پنچوں کے روبرو ہونا باعث شرم سمجھا جاتا تھا اب جو انگریزی عدالت آ گئی اس نے تو عدالت جانے کی لت ہی پیدا کر دی۔ زمینداری نظام نے زراعت کو زوال پر پہنچا دیا، کسان بجائے اپنے پیشہ میں توجہ دینے کے وہ زمیندار سے لڑنے میں وقت اور دولت صرف کرتا ہے اس کا نتیجہ جو تباہی لائے گا وہ ظاہر ہے۔ اودھ پنچ سے ایک اقتباس یہاں درج کیا جاتا ہے جو اس موضوع پر روشنی ڈالتا ہے:

> ''.....لیکن قانون نے ہندوستان کو نفاق کے جنگل میں سرگرداں رکھا ہے رات دن مقدمہ بازی ہے اس قدر سکت نہ تو کاشتکار میں ہے نہ مالگزار میں ہے اور نہ کچہری کی حاضر باشی سے فرصت ہے کہ اس زمین کو ناممکن ہے کہ ممکن کیا جائے۔ شبانہ روز کے مقدمات ہیں اور فسادات میں پیٹ کاٹ کاٹ کر کورٹ فیس ادا کیا جاتا ہے، کاشتکار پیشہ اس فکر میں غلطاں پیچاں رہتا ہے کہ زمیندار برباد ہو اور زمیندار کو کاشتکار کے برباد کرنے سے بڑھ کر کسی کام سے دلچسپی نہیں ہے..... رہا قحط اور آفت سے پاک ہونا اس کی امید کسی احمق ہی کو ہوگی یہ تو ہندوستان کے لیے جزو لاینفک ہوگیا ہے نہ تجارت کی آزادی میں رخنہ پڑے گا، نہ ہندوستان کو دونوں وقت پیٹ بھر روٹی ملے گی اور جب تک کاشتکار اور زمیندار میں جوتا چلے گا زراعت کو ترقی نصیب نہ ہوگی۔''[1]

انگریزی دور حکومت کی یہ سب سے اہم پالیسی تھی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں نفرت کے بیج بو کر یہاں کے عوام کو دست و گریباں رکھا جائے تا کہ ان کی توجہ کو زندگی کی اہم قدروں سے ہٹا کر اس طرح

---

[1] اودھ پنچ، ۳۰ر جون ۱۸۹۲ء

نفرت، حسد اور آپس کی دشمنی میں مشغول رکھنے میں آسانی ہو۔ انگریزوں نے یہ میٹھا زہر کچھ اس انداز سے ہندوستانی قوم کے جسم میں داخل کیا تھا کہ عام نگاہیں اس کا مشاہدہ نہیں بھی کرسکتی تھیں۔ علی گڑھ تحریک کی سرپرستی انگریزوں نے کچھ اس انداز سے کی تھی کہ وہ مسلمانوں کے سب سے بڑے مربی اور بہی خواہ معلوم ہونے لگے اور یہ انگریزی حکمت عملی کی جیت تھی کہ انھوں نے ایک طرف اردو کو مسلمانوں سے وابستہ کرتے ہوئے اس کے میلانات اور رجحانات کو اسلامی تہذیب سے وابستہ کرکے اسے صرف مسلمان ثابت کیا اور دوسری طرف ہندی کے لئے کو بڑھا کر اس کے رنگ و آہنگ کو سنسکرت سے اس طرح متعلق کردیا کہ اسے ہندو تہذیب کی ترجمانی کا شرف عطا کیا گیا اور اس خوبی سے کہ ایک عام ہندوستانی زبان کو جو فارسی کے غیر ملکی تسلط کے بعد پہلی عام ہندوستانی زبان ہوچکی تھی اور جسے خود کمپنی نے عام ہندوستانی زبان کا درجہ دیا تھا اب اس اختلاف کا شکار ہوجاتی ہے۔

اس اختلاف کی ابتداء انگریز عہدہ داروں نے اس طرح کی کہ انھوں نے اس زبان کے ''ایڈریس'' کا بنارس میں یہ کہہ کر جواب دیا کہ ہندوستان میں اکثریت ہندوؤں کی ہے اور انھیں اپنی زبان کو ہندوستانی بنانا چاہیے اس میں عربی فارسی کے غیر ملکی الفاظ شامل کرنا ہندوستانی قومیت کی رسوائی کا سامان ہے۔ اس طرح انھوں نے جہاں ہندی زبان کو اردو کا حریف بنانے کا خطرناک رجحان پیدا کیا، اسی طرح اردو کی مربیانہ سرپرستی کرتے ہوئے اسے صرف مسلمانوں سے وابستہ کردکھایا یہی وہ چنگاری تھی جو بہت جلد سید احمد خاں ہی کی زندگی میں ایک شعلہ بن گئی اور بنگال سے جو قومی تحریک کا پہلا مرکز تھا اردو کی مخالفت اور ہندی کی حمایت میں وہ آواز بلند ہوئی جس نے سید احمد خاں جیسے قومی رہنما کو متحدہ قومیت کے فریب سے آگاہ کردیا اور وہ اردو کی حفاظت اور حمایت کی خاطر قومی تحریک سے بدگمان ہوگئے۔

جب اردو ہندی کا جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا تو انگریزوں نے ہندوؤں کی کچھ اس انداز سے تائید کی کہ آج تک یہ مسئلہ دونوں قوموں میں نفاق کا باعث بنا ہوا ہے۔ اسی لیے بعض مفکرین کا یہ خیال ہے کہ ہندو-مسلم

تنازعہ کی بنا ہندی - اردو جھگڑے سے ہوئی۔ اس طرح انگریزوں نے پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کی پالیسی پر اپنی حکومت کی بنیاد رکھی جسے اودھ پنچ نے ادبی مضامین کے ذریعہ رد کیا اور ہندو مسلم، ہندوستانی تہذیب اور بھائی چارے پر زور دیا اور مسلمانوں کو ہندوؤں کا ہمنوا قرار دیا اودھ پنچ نے مسلمانوں کی اس حمایت کا پردہ ان لفظوں میں فاش کیا۔

''آپ جانتے ہیں اندھا کیا چاہے دو آنکھیں، مسلمان بہت روتے چلاتے ہیں کہ ان کا بجز خدا کوئی پوچھنے والا نہیں، مگر اب معلوم ہوا اور معلوم کیا ہمارے جاننے والے لفٹنٹ گورنر بہادر چلتے چلاتے اعتراف بھی فرمایا کہ مسلمانوں کے احسانات مجھ پر ہیں ہمیشہ ان کا احسان مند رہا ہوں اور رہوں گا..... یہی آرزو ہے اگر آرزو رہے آدمی تنکے کا احسان اتارتا ہے اگر ذاتی احسان سرکاری نوکری کے ذریعہ سے اتار دیا گیا تو یہ اپنی اپنی سمجھ ہے اس سے اور کچھ نہیں ہندو مسلمانوں میں چشمک تو ضرور ہی ہوجائے گی۔ ہندوستانیوں کا دستور ہے جب کسی مکان کو چھوڑتے ہیں تو وہاں کے چولہے کو جس کا ایک ہندو دوسرا مسلمان تھا اور جس پر اتفاق کی ہانڈی گرم ہوتی تھی چلتے وقت اس ٹھوکر سے توڑا۔ اگر یہ دونوں احمق ہیں، آپس میں جھگڑیں، حضت تو بھس میں چنگی ڈال الگ کھڑے ہوکر لطف دیکھیں گے۔''[1]

اودھ پنچ کے اگر تمام معاونین کا ہم بحیثیت مجموعی تجربہ کریں تو یہ بات وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ تمام مسافر ایک ہی کارواں سے تعلق رکھتے ہیں ان سب کی منزل اور مقصد ایک ہے اور ایک حد تک اپنے اس مقصد میں کامیاب بھی ہوئے جس کے لیے عزم سفر کیا تھا یہ کارواں مغرب پرستی کے بڑھتے ہوئے سیلاب کی روانی میں رکاوٹیں ڈالنے کی انتہائی کوشش کی۔ اور ایک حد تک اس کے جوش وخروش میں دھیما پن پیدا

---

[1] اودھ پنچ، ۱۰ر نومبر ۱۸۹۲ء،

کر دیا۔ یہ کام بھی معمولی کام نہ تھا، ملک کے سیاسی و سماجی حالات کو دیکھتے ہوئے بڑی جرأت کا کام تھا لیکن ان سرمستوں نے اس کام کو بڑی دلیری اور جوانمردی سے سرانجام دیا ان کا یہ کارنامہ بھی کم اہم نہیں۔

اودھ پنچ نے مغربی تہذیب کے زیر اثر جو عریانی اور بے حیائی عام ہو رہی تھی اس عریانی اور بے حیائی کا سد باب کیا۔ اس نے روساء و امراء کی اصلاح کی خاطر طنز و ظرافت کے پیرایہ میں پند و نصائح کے دفتر کھول دیئے۔ اس نے ہندو مسلم اتحاد و اتفاق کو مستحکم بنانے کے لیے عملی قدم اٹھایا۔ ایک دوسرے کے تہواروں، جلسوں اور خوشی و غم کے موقعوں پر ایک دوسرے کو شریک ہونے کے لیے ابھارا اور عوام کے دلوں میں محبت اور خلوص کا جذبہ پیدا کر دیا۔ رعایا اور حکومت کے درمیان تنازعات میں اودھ پنچ نے ہمیشہ رعایا کا ساتھ دیا اس نے البرٹ بل، انکم ٹیکس اور الحاق اودھ کی مخالفت میں پر جوش مضامین شائع کر کے حکام کی سیاسی غلطیوں کا پردہ فاش کیا۔

# باب دوم

## اودھ پنچ کے تہذیبی سروکار
## منشی سجاد حسین کے حوالے سے

## اودھ پنچ کے تہذیبی سروکار- منشی سجاد حسین کے حوالے سے

اردو ادب میں منشی سجاد حسین کا نام ایڈیٹر اودھ پنچ کی ہی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک صاحب طرز اور صاحب تصنیف کی بھی حیثیت سے قائم رہے گا۔ وہ صحافت کے راستے سے طنز و مزاح کی دنیا میں وارد ہوئے۔ انھوں نے مزاح کا رخ ''شخصی ت'' اجتماعیت کی جانب پھیر دیا اور اردو صحافت میں پہلی بار اپنے عہد کے سیاسی سماجی اور قومی مسائل کو ظرافت کے پردے میں بڑی متانت سے پیش کیا۔ افراد کے بجائے انھوں نے اقدار، مسائل اور موضوعات کو اپنا ہدف بنایا۔

منشی سجاد حسین نے ۱۶ر جنوری ۱۸۷۷ء میں لکھنؤ سے ''لندن پنچ'' کے طرز پر اودھ پنچ کا اجرا کیا۔ اودھ پنچ کے منظر عام پر آتے ہی فضا قہقہوں سے زعفران زار ہوگئی۔ اس کے جلو میں طنز و مزاح کا سیلاب اور مسکراہٹوں کے انار تھے۔ اودھ پنچ ایک سنجیدہ مسلک کے ساتھ مزاحیہ رنگ میں نکلا۔ یہ کٹر کانگریسی اور قوم پرست اخبار تھا اور اس کی پالیسی صلح کل تھی، یہ ہر مذہب و ملت کا نقیب تھا۔ اس کا فرض تمام ہندوستانیوں کے مسائل حل کرنا اور ان کے لیے سینہ سپر ہوجانا تھا۔

اودھ پنچ کی حیثیت سنگ میل کی ہے۔ اودھ پنچ میں منشی سجاد حسین نے آزادی کی جنگ قلم سے لڑی۔ قدامت اور مغرب پرستی کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور غلامی کی تن آسانی پر آزادی کی سخت کوشی کو ترجیح دی۔ ہر سیاسی معرکے میں اودھ پنچ نے ہمیشہ کانگریس اور ہندوستانی عوام کا بہت ڈٹ کر ساتھ دیا۔

''الحاق اودھ'' انکم ٹیکس ''البرٹ بل'' اور انگریز کے کالے قانون وغیرہ پر پریس ایکٹ کے باوجود منشی صاحب نے اودھ پنچ کے ذریعہ سخت تنقید کی۔ اسی کے ساتھ انھوں نے کورانہ تقلید اور زوال پذیر عناصر کا بھی خاکہ اڑا کر فضا میں اعتدال اور اعتماد بحال کرنے کی کوشش کی۔ وہ مشترکہ کلچر کی ترجمانی کے لیے ہولی،

○ دیوالی، بسنت اور شب برات کے موقع پر پتنگ والے سرخ و زعفرانی کاغذ پر اودھ پنچ کے بڑے رنگین نمبر بھی نکالتے جن میں ساقی نامے اور ترانے ہوتے۔ منشی سجاد حسین کا اودھ پنچ ایک مکتبہ فکر اور ایک ادبی عوامی تحریک تھا جس کا مقصد قومی شعور بیدار کرنا، تہذیبی جنگ لڑنا، سماجی ناہمواریوں پر بہت بیباکی سے طنز کرنا اور حق بات کہنا تھا۔

اردو ادب میں منشی سجاد حسین جدید مزاح کے بانی تھے۔ انھوں نے پہلی بار ہمارے لیے مزاح کی زمین ہموار کی۔ اردو نثر میں مزاح کی ایک نئی روایت کی بنیاد رکھی اور طنز و مزاح کو مہذب ظرافت میں شائستگی سے برت کے اس کا رخ تفنن سے افادیت کی جانب موڑ دیا۔ انھوں نے اجتماعیت میں انفرادیت کو نکھارا اور سیاسی، معاشی اور مذہبی مسائل کو گرفت میں لاکر بڑے سے بڑے معرکے سر کیے۔

قلم کے معرکوں کے لیے اودھ پنچ اردو ادب میں اہم بھی ہے اور بدنام بھی۔ ہمارے خیال میں اودھ پنچ کے ادبی معرکے جو ایک حد تک شخصی معرکے تھے اس لیے شد و مد کے ساتھ پیش آئے کہ ان سے اس اخبار کے دائرہ اثر کو بڑھانے میں مدد ملے۔ اس سے ادب و زبان کو ضرور فائدہ ہوا لیکن حقیقت میں ایک طرح کا صحافتی حربہ تھا جس کی مدد سے اودھ پنچ اپنے حلقہ اثر کو بڑھا سکا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ایسے موضوعات تلاش کیے گئے جن کی مدد سے عوام تک پہنچ کی ان کی دلچسپیوں پر اپنا قبضہ جمانے کا موقع ہاتھ آئے۔ یہ دوسری بحث ہے کہ یہ عمل کہاں تک درست ہے۔ اودھ پنچ نے ایسے ہی موضوعات سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ ظاہر ہے اس معرکہ آرائی میں ایسے بھی وقت آجاتے ہیں جب کسی فریق کو چھا جانے اور اپنا تسلط قائم کرنے کا موقع ملتا ہے اور بعض اوقات منھ کے بل گرنا بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس وقت وہ ایک شکست خوردہ کی طرح اول فول کہنے لگتا ہے۔ تہذیب و شائستگی کا پاس و لحاظ ختم ہو جاتا ہے۔ یہی کچھ حال اودھ پنچ کی معرکہ آرائیوں کا ہے۔ اس نے کئی جگہ نہایت کامیابی سے اور شائستگی سے اپنے فریق کو زیر کرنے کی کوشش کی۔ اس کے لیے اس نے اپنی ادبی، علمی اور صحافتی قوت کا استعمال کیا اور اس سلیقہ

سے کیا کہ نقاد کو اعتراض کا موقع نہیں ملتا۔ تاہم اس کی طویل زندگی میں اکثر ایسے مواقع بھی آئے ہیں جب اس نے شخصی حملے کر کے اپنے وقار کو مجروح کیا۔ یہ اودھ پنچ نے کہاں سے سیکھا اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ اسے لکھنؤ کے ادبی معرکے ورثے میں ملے تھے۔ ''انیسیوں'' اور دبیریوں کے معرکے تو اس کے لیے ماضی قریب میں ہو چکے تھے، اس سے قبل مصحفی اور انشا کے معرکوں نے اس میدان میں اپنے تجربے چھوڑے تھے۔ اودھ پنچ کے لکھنے والے اس سے کیوں کر فائدہ نہ اٹھاتے۔ ان قلمی معرکوں کے عیوب کو دیکھ کر ان کے محاسن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس طرح اودھ پنچ سے کچھ ہی عرصہ پہلے دلی کے دبستان شاعری میں ذوق و غالب کی آپس میں جو چشمک تھی اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان سب ادبی و صحافتی روایتوں سے اودھ پنچ کے لکھنے والوں نے استفادہ کیا گویا اودھ پنچ کی صحافت دراصل ادبی صحافت تھی جس میں قدیم و جدید رجحانات کا امتزاج تھا۔

منشی سجاد حسین کی ظرافت بڑی پہلودار ہے۔ وہ بیک وقت ایک اہم صحافی، کامیاب کالم نویس، زبردست طنز و مزاح نگار اور بہترین ناول نگار تھے۔ منشی سجاد حسین نے اپنے ۳۵ سالہ دور صحافت میں ہزاروں کی تعداد میں مضامین لکھے ہیں۔ لیکن کوئی بھی مضمون ان کے اصل نام سے شائع نہیں ہوا۔ کہیں وہ ''ارسطو'' ہیں تو کہیں ''نیاز مند قدیم'' کبھی وہ ''نظر باز'' ہیں تو کبھی ''صلاح کار'' اور ''مدبر'' کہیں وہ ''فاقہ کش ہندوستانی'' اور دیوالیہ کی صورت میں نظر آتے ہیں کہیں اللہ کا بندہ ''بگڑے دل'' یا ''کوئی ہوگا'' کے روپ میں موجود ہیں اور اکثر مضامین تو بغیر کسی نام کے ہیں یا پھر راقم کی جگہ مضمون اور عنوان کی مناسبت سے نہایت دلچسپ فقرہ لکھا ہوتا ہے۔ مثلاً راقم ''حلوائی دوکان پر دادا کا فاتحہ'' راقم ''پہنچاننے پہ ہے ناز پہچان جایئے'' راقم ''تہذیب کے سبب زبان اپنی بند ہے'' راقم ''مردوں کا آسمان تلے نام رہ گیا ہے'' راقم ''انگریزی دودھ کا جلا'' راقم ''آپ ہی بتایئے ہم کون ہیں'' راقم ''تمہارا تماشہ دیکھنے والا'' وغیرہ وغیرہ یا پھر اختتام میں کوئی مشہور مصرع یا شعر مندرج ہوتا ہے مثلاً: ''نہ من شہرت تمنائے دارم'' ''دیوانہ بکار خویش

ہشیار''، ''ساتھ لے دے کے یاروں کو''، ''مینڈ کی بھی چلی مداروں کو'' وغیرہ۔

نفس مضمون کے اعتبار سے سجاد حسین کے مضامین کو چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱- وہ مضامین جو خالص سیاسی مسائل سے متعلق ہیں۔

۲- سماجی معاملات پر مضامین۔

۳- ادبی اور تنقیدی مضامین۔

۴- اور آخری قسم ان مختصر مضامین کی ہے جو فکاہی کالم کے تحت لوکل علیہ الرحمۃ ''نوٹس'' ''تار برتر قیاں''، ''چہ میگوئیاں'' اور ''موافقت زمانہ'' وغیرہ کے عنوان سے شائع ہوئے ہیں۔

اگر چہ مضامین کو موضوعات کے اعتبار سے مختلف حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے لیکن ان سب کا طرز تحریر یکساں ہے کیونکہ منشی سجاد حسین کے تمام مضامین میں طنز وظرافت کی ایسی مشترک ڈوری بندھی ہوئی ہے جو ایک لحاظ سے ان میں باہم مطابقت اور وحدت پیدا کر دیتی ہے۔ خواہ وہ مضمون سیاسی ہو یا سماجی، ادبی ہو یا تنقیدی، سجاد حسین کی شوخ وطرار طبیعت ان میں طنز اور ظرافت کا اعلیٰ عنصر شامل کر دیتی ہے۔ ان مضامین کا مختلف موضوعات کے تحت جائزہ پیش ہے۔

## سیاسی مضامین

منشی سجاد حسین نے جس عہد میں اودھ پنچ جاری کیا اس عہد میں متعدد اخبارات مختلف صوبوں سے مختلف زبانوں میں نکل رہے تھے لیکن کسی بھی اخبار کو اپنے رائے کے آزادانہ اظہار کی جرأت نہ تھی۔ تقریباً تمام اخبار گورنمنٹ کے ہمنوا اور حکام کے مدح سرا تھے۔ منشی سجاد حسین نے اودھ پنچ کے لیے سب سے الگ راستہ اختیار کیا انھوں نے طنز وظرافت کا نیا معیار پیش کر کے فکاہی ادب میں طرز نو کی بنیاد ڈالی اور اپنے اخبار کو ایک معین اور آزادانہ پالیسی پر گامزن کیا۔ انھوں نے اپنے اخبار کو محض تجارت اور چاپلوسی کا ذریعہ

نہیں بنایا بلکہ مغربی اصول صحافت کو اپناتے ہوئے اسے قومی حقوق کا محافظ اور عوام کا ہمدرد، بہی خواہ بنایا۔ اودھ پنچ کی یہ ابتدائی پالیسی منشی سجاد حسین کے سیاسی رجحانات کو سمجھنے میں کافی معاون اور مددگار ثابت ہوتی ہے۔ ان کے سیاسی مسائل پر لکھے ہوئے تمام مضامین اسی سیاسی رجحان کی غمازی کرتے ہیں جس کی بنیاد اودھ پنچ کی آزادانہ اور مقرر پالیسی تھی۔ لہٰذا جہاں تک منشی سجاد حسین کے سیاسی نظریات کا تعلق ہے وہ ابتداء ہی سے انگریزی حکومت کو ہندوستانی عوام کے حق میں دشمن تصور کرتے تھے اور نوابین، راجاؤں اور رؤسا کو بھی انگریزی حکام کی طرح ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ وہ عوام کے سچے ہمدرد اور مخلص دوست، تعصب اور تنگ نظری سے کوسوں دور، ہندو اور مسلم اتحاد کے زبردست حامی، الحاق اودھ، انکم ٹیکس اور البرٹ بل کے سخت مخالف تھے۔ ''اودھ پنچ کے اجراء سے تقریباً نو سال بعد ۱۸۸۵ء میں جب کانگریس کی بنیاد پڑی تو منشی سجاد حسین کو اپنے اور کانگریس کے نظریات و مقاصد میں بہت حد تک مماثلت نظر آئی چنانچہ عرصہ دو سال میں کانگریس کو اچھی طرح سمجھ کر ۱۸۸۷ء میں اس کے باقاعدہ رکن بن گئے۔''[۱]

جیسے جیسے کانگریس کے اغراض و مقاصد فدویانہ اور نیاز مندانہ حدود سے باہر ہوتے گئے ان کا اعتقاد اسی اعتبار سے کانگریس پر پختہ اور مستحکم ہوتا چلا گیا، بالآخر وہ کانگریس کے کٹر ہمنوا بن گئے۔ اگرچہ ان کا اخبار اودھ پنچ ابتدا سے ہی ایک مقرر اور معین پالیسی اختیار کیے ہوئے تھا تاہم سجاد حسین کی کانگریس میں شمولیت کے بعد اودھ پنچ نے ایک خاص سیاسی نظریے کی پیروی شروع کر دی یعنی کانگریس کے نصب العین کی وکالت کرنا اور اس کے نام اغراض و مقاصد کو فروغ دینا اور بلاشبہ اودھ پنچ اس مقصد میں کامیاب ہوا۔ صوبے کے جن حصوں میں کانگریس کا گزر نہ تھا وہاں اودھ پنچ نے عوام کی ذہنی رہنمائی کی اور اپنے چٹ پٹے مضامین سے نہایت قلیل مدت میں وہ کام کر دکھایا جو ایک ذہین اور بہترین مقرر عرصہ دراز میں کر سکتا تھا۔ منشی سجاد حسین اور اودھ پنچ نے جس نازک دور میں کانگریس کی مدد کی اور اس کے اغراض و مقاصد کی نشر و اشاعت

---

۱ ڈاکٹر مصباح الحسن قیصر، اردو طنز و ظرافت اور منشی سجاد حسین، ص: ۱۶۰

کے لیے جتنی بے جگری سے کام کیا اسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ کانگریس کی حمایت میں ان کا ایک مضمون پیش کیا جارہا ہے:

''اے مخالفین کانگریس و منافقین ہندوستان، اے پیروان سرسید و خوش آمدیان حکام ادنیٰ مقام! روؤ، پیٹو، چلاؤ، پچھاڑیں کھاؤ، بڑا غضب بلا کا ستم ہوگیا، ہائے ہائے اور وائے وائے تم نے یارو کس بری ساعت سے کانگریس کی عداوت کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ زک پر زک، ہزیمت پر ہزیمت ہوتی ہے۔ کسی بڑے ہی جدوجہد اور ہزاروں چلا کیوں ترکیبوں سے دم بھر کے واسطے آنسو بجھے بھی تو فوراً ہی وہ گھن گرج صدمہ پہنچا کہ برسوں کی مسرت خاک میں مل گئی۔ اب تم ہو اور اہل کانگریس کے حق میں گالیاں، کوسنے اور یہ شعر زبان پر۔

تبسم سے نہیں لب آشنا ہوئے کبھی برسوں
ہنسے تھے زخم ساں گاہے سو روتے ہیں لہو برسوں

تازہ مصیبت گرما گرم آفت تم پر یہ نازل ہوئی کہ انجمن اسلامیہ نے جو ہزاروں جائز و ناجائز رزلیوشن پاس کیے تھے کہ اس سال کانگریس میں ڈیلیگیٹ نہ بھیجے جائیں گے اور جس پر سنا گیا تھا کہ اس سال کانگریس تمھارے یہاں نوبت یہ شادی مرگ پہنچی تھی اور تم میں غلغلہ تھا شور تھا کہ اہل کانگریس کے دل ہل گئے، کمال افسوس ہے کہ ۲۷/اگست ۱۸۸۸ء کی کارروائی انجمن موصوف نے اس رزولیوشن کو حرف غلط کی طرح حک کردیا تم نے ہنسی کے واسطے جو منھ کھولا تھا وہ گریہ و بکا کے کام آیا ٹوپی آسمان پر اوچھالی تھی، خلقی قانون کشتی اتصال کی رو سے اپنے مرکز نقل ڈھونڈتی زمین پر آگری یعنی مسلمانان بمبئی نے انجمن اسلامیہ کی معرفت فیصلہ کردیا کہ اولاً اپنے وکلاء کانگریس میں ضرور بھیجیں۔''[1]

---

[1] اودھ پنچ، ۳۰/اگست ۱۸۸۸ء

منشی سجاد حسین کے سیاسی مضامین کی فہرست بہت طویل ہے اودھ پنچ کا کوئی شمارہ ایسا نہیں ہوتا تھا جس میں کسی موضوع پر ان کا کوئی مضمون نہ ہوتا۔ منشی سجاد حسین کو سیاست سے خاصا شغف تھا، اس لیے وہ ملک کے داخلی سیاسی رجحانات اور معرکہ آرائیوں سے کما حقہ باخبر رہتے بلکہ خارجی سیاست کا بھی پورا علم رکھتے تھے۔ ہندوستان اور بیرون ہندوستان کے وہ تمام مشہور سیاسی واقعات و حادثات جن کا تعلق عوام سے ہوتا منشی سجاد حسین کا موضوع سخن بنتے اکثر وہ نہایت معمولی معمولی اور غیر اہم واقعات سے اپنے مطلب کی چیز اخذ کرتے اور اسے اپنے مخصوص طرز تحریر میں اس طرح پیش کرتے کہ سیاست کو خشک بے مزہ اور غیر دلچسپ سمجھنے والے اشخاص بھی اس کو دلچسپی سے پڑھتے اور محظوظ ہوتے تھے۔ منشی سجاد حسین کے اکثر مضامین کو سمجھنے میں عوام کو دشواری محسوس ہوتی ہے اور اس عہد کے تہلکہ مچا دینے والے مضامین میں بھی وہ دلچسپی پیدا نہیں ہوتی جو دور حاضر کے سیاسی مسائل سے متعلق مضامین کو پڑھنے میں ملتی ہے تاہم ان تمام حقائق کے باوجود آج بھی ان کے اکثر مضامین دلکشی اور رعنائی کے اعتبار سے اپنا جواب نہیں رکھتے۔ سیاسی مسائل میں طنز و ظرافت کی چاشنی منشی سجاد حسین کا انوکھا انداز ہے جسے ہمیشہ پسند کیا جائے گا۔ منشی سجاد حسین کے ان سیاسی مضامین میں ''انڈے بچے والی چیل چلہاڑ'' ''کھلے خط سربستہ مضامین'' ''نیچر کا مارشل لا'' ''مٹی خراب خلق میں مہر وفا کی ہے'' ''ہڈیوں پر میری لڑتے ہیں سگان کوئے دوست'' ''جھنجھٹ کا یہ مزہ ہے کہ ہوں وہ بھی بے قرار'' ''بے مار کی توبہ'' ''پروفیسر اودھ پنچ کی پولیٹکل اقلیدس'' ''ٹیکس کی دم'' ''امیر کابل اور سرکار انگلشیہ'' ''منھ لگائی ڈومنی گائے'' ''تال بے تال'' ''یہ مبارک جنگ کا چندہ ہے'' ''پولیٹکل باغ و بہار یعنی قصہ چہار درویش'' ''قانون اور اس دم ترمیم'' ''دورہ وائسرائے انگن ریاست حیدرآباد دکن'' وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ منشی جی کے یہ وہ سیاسی مضامین ہیں جنھوں نے اپنے عہد میں ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہلچل مچادی اور مزاح کے پیرائے میں حکومت کے ان عیبوں کو طشت از بام کیا جس پر انگشت نمائی اس وقت سیاسی لیڈروں کے لیے ممکن نہ تھی اور انداز چونکہ مزاح کا تھا اس لیے قانونی گرفت

سے بھی بچے رہے۔ وہ مزاح کے پردے میں حکومت اور حکام وقت پر کڑی تنقید کرتے رہے اور اس طرح وہ تحریک آزادی میں پوری طرح شریک رہے۔ ان مضامین کی سیاسی اہمیت کے علاوہ ادبی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ان کے اکثر مضامین زور قلم اور زبان دانی کی بہترین مثالیں ہیں جن میں طنز وظرافت کے لہجہ میں بھی زبان اور محاورات کی درستی کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ مزید برآں ان مضامین کو طنز و ظرافت کی تاریخ میں اولیت بھی حاصل ہے کیونکہ ان مضامین میں سیاست کو پہلی بار طنز و مزاح کا موضوع بنایا گیا ہے۔

۳ر دسمبر ۱۸۸۹ء کو جب کانگریس کا اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہونے والا تھا تو کانگریس کی مخالف جماعت ''اینٹی کانگریس'' نے لکھنؤ میں بڑے زور وشور سے اپنے جلسے کرنے شروع کردیئے۔ ایک جلسے کے اعلان کے اشتہار میں کانگریس کے مخالفوں نے کہیں یہ لکھ دیا اس جلسے میں مع اعزا و اقربا واحباب متعلقین کے شرکت فرمائیں اور گورنمنٹ کے خیرخواہ بنیں۔''[1]

منشی سجاد حسین کی ذہین اور نکتہ شناس طبیعت نے صرف ایک لفظ متعلقین کو گرفت میں لے کر ''انڈے بچے والی چیل چلہاڑ'' کے عنوان سے ایسا دلچسپ مضمون لکھا کہ کانگریس کے مخالفوں کے چھکے چھوٹ گئے ساری محنت رائیگاں گئی اور ان کی ہر بات قہقہوں اور چٹکیوں میں اڑادی گئی اسی مضمون کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

> ''بھلا یہ کیونکر ممکن ہے کہ بی کانگریس صاحبہ لکھنؤ مرحوم میں جان تازہ پھونکنے چہرے کی رونق بڑھانے خراماں خراماں تشریف لائیں اور بی اینٹی صاحبہ چپ شاہ کی بالکی نمونہی بنی منہ میں گھنگنیاں بھرے بیٹھی رہیں اجی توبہ کیجئے بولیں اور بیچ کھیت بولیں اس طرح بولیں جیسے ارہر کے کھیت میں پہندیت بیٹر، بلکہ گلہ پھاڑ کے غل مچاکے سارا شہر سر

---

[1] ڈاکٹر مصباح الحسن قیصر، اردو طنز وظرافت اور منشی سجاد حسین، ص:۱۱۶

پر اٹھا کے جس میں یہاں سے لندن تک خبر ہوجائے کہ لکھنؤ میں بھی کچھ اینٹی بھائی ہیں چنانچہ یوں تو عرصے سے سٹر پٹر چلے ہوتے تھے اور بعض حضرات اپنے نزدیک حق ادا کرنے یا مستحق بننے کی کوشش کرتے تھے مگر جب دیکھا کہ کانگریس کا اجلاس سر ہی پر آپہونچا ادھر حضور وائسرائے بھی عنقریب دربار فرمانے والے ہیں چھتری سرکش بھی تماشہ کررہا ہے الفریڈ تھیٹریکل کمپنی بھی آئی ہے ان حضرات کو بھی مثل عارضہ متعدی نیچ نچی چھوٹی بے چینی بڑھی مادہ ہیجان میں آہی، اور ایک بار آنکھ بند کر کے کچکچا کے ''عظیم الشان جلسہ اینٹی کانگریس'' کا اشتہار دے ہی دیا...... اس نیاز مند طریقین کو یہ پوچھنا ہے کہ مخالفین کانگریس کے متعلقین کو جو تکلیف دی گئی ہے اس کا انتظام کیا فرمایا گیا ہے کیونکہ اپنے اینٹی بھائیوں سے کچھ بعید نہ سمجھئے کہ کنجڑوں کی طرح سے مع متعلقین جلسے میں آموجود ہوں کیا معنے کہ اعزو اقربا اور احباب کے علاوہ مخصوص متعلقین کو بھی آپ نے یاد فرمایا ہے اور یہ بھی غالباً مشتہرین جانتے ہوں گے کہ متعلقین بی گھر بسی بھی گھر کے لوگوں کو یعنی لڑکوں کی والدہ یعنی اے جی یعنی بیگم خانم صاحبہ یعنی جورو جی یعنی زوجہ معظمہ طال اللہ پائنچہا وآنچل الڈوپٹھا علی رؤس الشوہرین الی یوم الوفات بل بعد الممات کو کہتے ہیں تو ان ذات شریف کے اوٹھ کھڑے ہونے میں کوئی کسر باقی نہ رہی جس طرح تھیٹر سرکس گھوڑ دوڑ کے جلسوں میں اکثر اتفاق ہوتا ہے۔ اسی طرح یہاں بھی آدھمکیں اور یہ بھی دور نہ سمجھئے کہ جب سارا گھر یوں شریک ہوگا تو اس دن ضرورت کا سامان بھی ہمراہ ہوگا۔ خواصیں اور پیش خدمتیں، شیر خوار بچہ جس کے ابھی ٹیکہ لگا ہوگا اور دانہ ابھرنے یا دانت نکلنے کی وجہ سے چڑچڑا رہا ہوگا پھر اس کا گہوارہ پالنا جھنجھنا چُسنی انا چھوچھو مع برادر رضاعی اس کے علاوہ بکری کا بچہ چند خرگوش اور چینی چوہے طوطے کا پنجرہ جوریز کم کرتا ہے اور

خاص اس مصلحت سے آئے گا کہ بولنے والوں کی بولیاں یاد کرے باورچی خانے کا بگلہ، انا کے صاحبزادے نطفۂ ناتحقیق کا پالا ہوا لینڈی کتے کا پلہ چھوٹی صاحبزادی کا گلہری کا بچہ بی گربہ خانم مسماۃ پسی، کبوتروں کی کابک، مرغی کا ٹابہ، بٹیروں کے تھیلے، بیگم صاحب کا پاندان یعنی سب کچھ دان آفتابہ آئینہ اگلدان طشت، تسلہ، لوٹا، ڈھولک، باپان مجیرے، بچھونے، گاؤ، بچے کے پوڑیے، ٹہالچے، لحاف، توشک، سلامتی سے بھی ہوا چاہیں۔''[1]

امیر عبدالرحمٰن خاں والی کابل کے خیالات منشی سجاد حسین کی زبان میں ملاحظہ ہوں۔ انگلینڈ اور روس میں چشمک تھی اور والی کابل انگلینڈ کے وفادار دوست تھے روس نے موقع پاکر ان کے ملک پر دست درازی کی اور کابل خطرے میں پڑ گیا۔ ایسی ہنگامی حالت میں جو کچھ ان کے دلی جذبات و خیالات ہو سکتے تھے سجاد حسین نے اپنے مخصوص طرز تحریر میں عوام کو مطلع کیا ہے:

''گھوڑے گھوڑے لڑیں، موچی کا زین ٹوٹے بھلا پوچھئے مجھے ان باتوں سے کیا مطلب۔ اپنے انگریز جانیں، روس جانے ''گوش خرد ندان سگ'' حیرت میں ہوں کیا کروں اگر عوام کا تقضیہ ہو حاکم وقت سے استغاثہ کیا جائے اب یہ فرمایئے کس دربار میں داد بیداد مچائی جائے صرف ایک احکم الحاکمین ہے، وہ قیامت کے دن اجلاس کا وعدہ کرتا ہے چلو۔

نا تو بمن میری من بخدا سے رسم

اگر یورپ ہوتا تو اور ہمعصروں سے کہا سنا جاتا یہ کمبخت ایشیا تو یورپین پولیٹکل کالج کے ناہموار طلبا کے واسطے گیند دھڑکے کا میدان ہے جو جی چاہتا ہے کرتے ہیں کوئی بات بیجا نہیں۔ اب میرے واسطے سردست سوا اس کے اور کچھ مناسب معلوم نہیں ہوتا کہ

---

[1] اودھ پنچ: ۳۰ر نومبر ۱۸۹۹ء

جہاں تک ہو سکے انگریزوں سے روپیہ اینٹھوں پھر دیدہ خواہد شد کس کی رہی اور کس کی رہ جائے گی۔''[1]

لیکن سیاسی اعتبار سے منشی سجاد حسین کے ان خطوط کو زیادہ اہمیت حاصل ہے جو اودھ پنچ میں ''کھلا خط سر بستہ مضمون'' کے عنوان سے شائع ہوتے ہیں۔ اس عنوان کے تحت انھوں نے ملکہ وکٹوریا یا قیصر ہند گلیڈ اسٹون وزیر اعظم انگلستان، لارڈ ڈفرن وائسرائے ہند نظام حیدرآباد دکن، نواب اسماہ مدار المہام حیدرآباد دکن، شہزادی سلطان جہاں بیگم والیہ بھوپال، مہراج کشمیر اور نواب ریاست رامپور وغیرہ کو کھلے خطوط ارسطو کے فرضی نام سے تحریر کیے ہیں۔ بظاہر ان خطوط کا انداز مشفقانہ اور ناصحانہ ہے لیکن حقیقت میں یہ خطوط انگریزی سیاست دانوں اور ان کے ہندوستانی مریدوں کی خامیوں اور بدعنوانیوں کے کھلے چھٹے ہیں۔ ان کے ذریعہ سجاد حسین نے استعارات رمز و کنایات اور طنز و مزاح کے پردے میں انگریزی حکام اور حکام پرست اصحاب کی ان دکھتی رگوں پر نشتر لگایا ہے جن میں فاسد مادہ حد اعتدال سے زیادہ سرایت کر چکا تھا۔ انھوں نے انگریزی حکومت کے عروج کے زمانے میں باتوں ہی باتوں میں ان خطوط میں سب کچھ کہہ دیا ہے جس کو کہنے کی جرأت بھی ایک عام انسان نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن ان خطوط کی اہمیت صرف اسی لیے نہیں ہے کہ یہ خطوط جرأت مندی کا نمونہ اور عوام کے دکھ بھرے دل کی پکار ہیں بلکہ یہ خطوط لطیف طنز اور بہترین ظرافت کی بھی مثال ہیں ان خطوط سے چند اقتباس ملاحظہ ہوں۔

نظام حیدرآباد دکن کو ایک خط میں یوں رقمطراز ہیں:

''عاشق و معشوق کے خطوط کیسی احتیاط سے کیوں نہ بند ہوں ضرور تاڑ لئے جاتے ہیں وہ ان کا وزن وہ چاروں طرف سے نئی نویلی دلہن کی طرح سمٹا سمٹایا ٹھسا ٹھس بندنا ہونا وہ گوند کی چار تہیں، وہ سینکڑوں تختے کاغذ اور لمبے چوڑے مضامین۔ ارمانوں

---

[1] اودھ پنچ، مطبوعہ ۱۸۸۹ء

آرزوؤں حسرتوں کے جم غفیر سے چست اور تنگ لفافے کے گوشے سطحہ معشوق نوخیز کے سینہ و بازو کی طرح ابھرے اور بھرے بھرے وہ اعلیٰ درجے کا کاغذ وہ انتہا کی خوش خطی وہ خوشبوؤں میں بسا ہونا وہ بند کرنے کی جگہ پر اکثر پانی کی ہلکی سے سرخی وہ اسم برخاتمہ وہ دوسروں پر طلاق یہ سب محبت الفت شکوہ شکایت راز بتاتے لب اور پانی خوردہ کی شیرینی ظاہر کرتے ہیں مشاق اور نظر باز ۔

خط کا مضمون تاڑ لیتے ہیں لفافہ دیکھ کر

پس ہندوستانی رئیسوں کے ساتھ گورنمنٹ انگریزی کی مراسلہ بازی وہ رزیڈینٹ کا جانا آنا وہ مراسلہ لانا وہ تخلیے میں ہی سرگوشیاں وہ اخفا میں اہتمام جو کچھ ظاہر کرتا ہے اس بوڑھے خرانٹ پر آئینہ ہے مجھ کو تو تم جانو ہندوستانی نہ دکنی پارسی نہ مدراسی انگریزی نہ ارمنی میں تو باشندہ دنیا ہوں۔ میری نظر وسیع میں سب یکساں۔ پس میری صلاح و مشورت میں کسی کی خبرداری کو دخل نہیں ہوسکتا فی الحال ہندوستانیوں دکنیوں کا چڑھاؤ اتار ریاست کو ہنڈولا بنائے ہے۔ تم کو لازم ہے سب میں اپنا مطلب مقدم رکھو نہ وہ افراط کی ادھر سے کوئی بھی بال کترا جھاڑن کا کوٹ پتلون پہن کھڑے گھاٹ نیچری بن سید صاحب پیالہ پی چٹھی کے چادر گھاٹ جا اترا اور آنکھ بند کر تمھارے یہاں سے تنخواہ عہدہ جگہ کام سب بگٹٹ چلا آتا ہے بلکہ اسٹیشن پر ریل سے قدم نیچے رکھا نہیں کہ تنخواہ بیش قرار نے نذر دکھائی عہدے نے سلامی اتاری اور ترقی کی چوکڑی پر یہ جا وہ جا۔[1]

(راقم ارسطو)

ایک اور خط میں نظام حیدرآباد کو ان کے مصاحبین پر چوٹ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

[1] اودھ پنچ، جلد: ۱۷، ۱۹/ اکتوبر، ۱۸۹۳ء

''..... جب گدھوں کی کافی تعداد بن چکی اور بہت سا تخم باقی رہا تو ملائکہ نے خداوند تعالیٰ کے حضور میں عرض کیا اس کو کیا کرنا چاہیے۔ حکم ہوا ان کو صورت انسانی میں لاکر اور کسی بلند مقام پر کھڑے ہوکر زمین پر برسادو۔ چنانچہ چار مینار سے ان حضرات کی بارش ہوئی غالباً انھیں میں سے دو چار تمھاری مصاحبت میں آگئے ہیں۔ تم کو یہ بات ہر وقت ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے کہ رئیس ریاست کے واسطے بنا ہے نہ عیش و آرام، لہولعب کے واسطے، کسی سے ناچاقی عداوت، شکر رنجی کچھ ہی کیوں نہ ہو مگر کوئی وجہ نہیں انتظام ریاست کی باگ ڈور چھوڑ دی جائے۔ ملک کی رونق رعایا کے دل سے فرحت اس طرح فرار ہو جیسے تمہارے دیوان کے دماغ سے تمھاری عظمت تم خفا ہو خوش ہو لڑو جھگڑو جو چاہو کرو مگر ملک کی جانب سے غفلت نہ کرو۔ اور خدا کے یہاں گنہگار نہ ہو۔ مردم شناسی کرو، قدر دانی میں مشق بڑھاؤ، ملک کے رنج و راحت کو اپنا رنج و راحت بناؤ تب حق سے ادا ہوگے ورنہ پولو میں کرتب دکھانے یا گھوڑ دوڑ میں بازی جیتنے سے کچھ نہیں ہوتا تم رئیس ہو نہ سوار و سائیس۔''[1]

(راقم ارسطو)

ایک خط میں بیگم بھوپال کو مخاطب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دام بھوپالہا: غالباً اس غیر مانوس دعا پر تم مسکراؤ اور دل میں سوچو اقبالہا کا بدل بھوپالہا کیسا۔ سو اس کی وجہ یہ ہے کہ سلامتی سے تمھاری ذات مجتمع صفات میں خداوند تعالیٰ نے تمام خوبیاں جو آج کل اقبال مندی کے واسطے لازمی ہیں بدرجہ اتم کوٹ کوٹ اور ٹھونس ٹھونس کر بھری ہیں تمھاری حق میں ایسی دعا تحصیل لا حاصل ہے۔ رہی بھوپال کی

---

[1] اودھ پنچ، جلد:۲۳، ۷ ستمبر ۱۸۹۹ء

تخصیص وہ خمیر زمانہ دیکھتی ہے۔ اس میں برا ماننے کی بات نہیں خدانخواستہ کوئی بدشگونی ہے نہ بدفال صرف احتیاطاً زمانے کا رجحان یاد دلا دینا ہے۔ ..... تمھاری کارروائی نسبت عقد سید صدیق حسن شخصی اور پولیٹکل لحاظ سے قابل ملامت یا لائق عفو مگر سردست اس سے بحث کرنا بے موقع ہے۔ مضٰی بامضٰی ہاں جو کچھ بعد عزل سید صدیق حسن تم نے کیا ہے اور اس کو میں ہرگز قابل اعتراض نہیں پاتا حاکمانہ اور معشوقانہ اداؤں میں ابہام اجمال اور اخفا کے ذریعہ اسے ایسے مہمات سرانجام پاتے ہیں کہ جن کا طے ہونا دوسری طرح سے ممکن ہی نہیں۔ پس سر لیبل گریفن اور سید صدیق حسن کے ساتھ جو کچھ برتاؤ اب تک ہر طرح لائق پسند ہے۔ دنیا میں پالیسی اسی کا نام ہے اول تو آج کل اسی کی فصل ہے۔ دوسرے یہ طریقہ تمھاری جنس کے موافق مزاج و سرشت بھی ہے عمل درآمد میں بہت تکلف بھی نہ کرنا پڑے گا۔ ..... یہ سمجھ لو سید صدیق حسن تمھارے صرف شرعی شوہر ہیں نہ ریاست بھوپال کے پولیٹکل شوہر شخصی طور سے جو چاہو کرو مگر پولیٹکل امور میں پالیسی ہی برتو۔ گرتے کو اٹھانا، ڈوبتے کو سنبھالنا، انسانی ہمدردی اور جرأت کا کام ہے۔ مگر دو مختلف الاصول حرکات کو نیکی ہی کے کیوں نہ ہوں ہمیشہ موجب فساد ہوتے ہیں۔ مثلاً: انصاف اور رحم، انصاف اگر ہے رحمدلی کی، رحمدلی ہے تو انصاف کدھر۔ اسی طرح خودغرض جابر متعصب شوہر کی اطاعت میں حق رسانی رعایا نوازی معدلت مذہبی آزادی ندارد۔''[1]

(راقم ارسطو)

---

[1] اودھ پنچ، جلد: ۲۶، ۱۰/اکتوبر ۱۹۰۱ء

## سماجی مضامین

منشی سجاد حسین کے عہد میں جو مسائل درپیش تھے وہ معاشرتی اصلاح سے متعلق تھے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ اس وقت سماجی مسائل نسبتاً زیادہ لائق توجہ تھے۔ سجاد حسین اگرچہ سیاست میں جدیدیت کے قائل تھے تاہم نظام معاشرت میں سخت قدامت پرست واقع ہوئے تھے۔ وہ مذہبی اور قومی رسم و رواج کو دیرینہ شکل میں دیکھنے کے خواہشمند تھے اور ان میں کسی اصلاح کے مطلق قائل نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کی سیاسی، سماجی اور مذہبی اصلاح کے لیے قدم اٹھایا تو سجاد حسین نے اس کی سخت مخالفت کی۔ ایک ہندوستانی کے ہاتھوں ہی ہندوستانی زوال پذیر تہذیب کا رہا سہا نشان مٹتے اور مغربی تہذیب کا چراغ جلتے دیکھ کر انھیں ضبط کا یارا نہ رہا۔ چنانچہ علی گڑھ تحریک اور سرسید احمد خاں کی ذات ان کے مضامین کا خاص موضوع بن گئی۔ ہر موضوع میں اس تحریک کا استہزاء اور سرسید احمد خاں کا مضحکہ اڑایا جاتا۔ انھیں پیر نیچر جیسے خطاب سے نوازا جاتا اور ان کو طنز و تمسخر کا نشانہ بنایا جاتا بلکہ ان کی شخصیت کو مسخ کرنے کی کوشش کی جاتی مثلاً اپنے ایک اداریے میں سرسید اور تعلیمی کانگریس کا تمسخر اڑاتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''سرسید کی تعلیمی کانگریس کے اس قدر اجلاسوں کا نتیجہ اس طرح غائب ہے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ اس پر طرہ یہ کہ اب اس بیچاری کا کہیں تھل بیڑا نہیں لگتا۔ دھوبی کے کتے کی طرح گھر کی نہ گھاٹ کی۔ پٹنے والوں نے دور سے دھتا بتائی اب بمصداق دست شکستہ و بال گردن یہ بھی علی گڑھ کے گلے میں لٹکائی جائے گی اگر کوئی دوسرا غیرت مند ہوتا تو ایسے فضول ڈھکوسلے کو کب خیر باد کہہ چکا ہوتا مگر بے شرمی و بے حیائی بھی استقلال کے واسطے ایسی جگہ بڑی نعمت ہے۔ ہم سمجھتے ہیں بہتر ہوتا ہے کہ اس پیرانہ سالی میں اس سالانہ بازیچۂ اطفال سے کنارہ کشی کی جاتی ورنہ اندیشہ ہے حمقا شماری

کرنے والے فہرست ممبران کی نقل کام میں لایا کریں گے۔''[1]

تحریر کا یہ انداز ایک بلند پایہ صحافی کی شان کے منافی ہے بلکہ یہ مزاح نگاری بھی نہایت پست درجہ کی کہلائے گی شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ سجاد حسین کی رائے میں اگر علی گڑھ کالج ایک لادینی ادارہ اور انگریزی تہذیب وتمدن کی اشاعت کا ایک مرکز تھا تو سرسید احمد خاں اس الحاد اور روشن خیالی کے قائد اعظم تھے اور چونکہ مذہبیت اور اپنی تہذیب وتمدن سے شدید محبت سجاد حسین کی نس نس میں پیوست تھی لہٰذا وہ سرسید اور ان کے ہمنواؤں کی مغرب پرستی کو برداشت نہ کر سکے انھوں نے اس کی کھل کر اور ڈٹ کر اتنی شدومد سے مخالفت کی کہ بعض اوقات صحافت اور مزاح نگاری کے تمام اصولوں کو بالائے طاق رکھ دیا وہ بیرونی سامراجیت اور نئی روشنی کے کٹر دشمن بن گئے۔ مغربی تہذیب کی کورانہ تقلید سے اہل وطن کو بچانے اور اس کے مضر اثرات سے آگاہ کرنے کے لیے انھوں نے اپنے قلم کا سارا زور صرف کر دیا۔ اگر چہ ان کی ان کوششوں سے سرسید اور سرسید تحریک کو کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا اور نہ ہی سماج کو کوئی قابل ذکر فائدہ ہوا تاہم اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ مغرب پرستی کے حد سے بڑھتے ہوئے سیلاب میں ایک توازن یا دھیما پن ضرور پیدا ہو گیا۔

سرسید اور تحریک سرسید پر لکھے ہوئے مضامین میں ''علی گڑھ کالج'' ۲۱ر ستمبر ۵ر اکتوبر ۱۸۹۹ء ''علی گڑھ کی شہرت'' ۳ر مئی ۱۹۰۰ء منشی سجاد حسین کے قابل ذکر مضامین ہیں۔

علی گڑھ تحریک اور سرسید کی مخالفت کے علاوہ انھوں نے آزادی نسواں کی سخت مخالفت کی مغربی اثرات سے خواتین میں انگریزی تعلیم اور بے حجابی کا جو دور دورہ شروع ہو گیا تھا وہ اس سے ہمیشہ نالاں رہے اور اس کی ساری ذمہ داری انھوں نے ان مصلحین کے سر تھوپی جو تعلیم نسواں اور بے پردگی کی حمایت میں اصلاح کے نعرے لگا رہے تھے۔ چنانچہ ان کے اکثر مضامین میں خواتین سے زیادہ ایسے حضرات کو طنز وتضحیک

---

[1] اودھ پنچ: ۵ر نومبر ۱۸۹۱ء

کا نشانہ بنایا گیا جو حریت نسواں کے بڑے علمبردار تھے اپنے ایک مضمون ''سہل لٹکہ'' میں ان مصلحین کے سامنے یہ تجویز پیش کرتے ہیں:

''آج کل بعض خواہ مخواہ کے روشن خیال گروہ میں اس بات کی سخت کوشش ہو رہی ہے کہ جس طرح ہو عورتوں کا پردہ اٹھا دیا جائے۔ ساری برکتیں اس میں مخفی ہیں اور مسلمانوں کی یہ ردی حالت اس کی بدولت پہنچی ہے۔ بی صاحب نے پردہ اٹھایا، چہرہ بے نقاب کا جلوہ دکھایا اور دنیا کی بہبود و ترقی گدا گد آسمان سے گرنا شروع ہوئی۔ مردوں کا پڑھنا لکھنا کام کا جی ہونا کچھ ضروری نہیں صرف عورتوں کو پردے سے نکالیں، درشتی ہنڈیاں بھنانا شروع کریں۔ چنانچہ اس گروہ کے ٹنڈیل ہمارے میاں محبّ حسین صاحب حیدرآبادی اٹھ کھڑے ہوئے اور لگے کوشش کرنے۔ آپ جانئے مدتہا مدت کی پرانی زنگ خوردہ رسم کو اٹھانا کوئی ہنسی ٹھٹھا تو ہے نہیں ایک ذری سا قفل ہوتا ہے اس کے کھولنے میں لوہے لگ جاتے ہیں اور یہ تو آہنی دیوار ہے کٹتے کٹتے کٹے گی۔ پس ایں جناب نے آسانی کے خیال سے ایک ایسا نسخہ تجویز کر دیا ہے اگر محبّ حسین صاحب بجائے اس جھگڑے فساد کے جاری کر دیں تو پردہ آپ سے آپ پھٹ کے جگر عاشقی یا چھوٹی ہوئی مہتاب یا چاندنی مارا کتاں ہو جائے پھر نہ مردوں کو غیرت نہ عورتوں کو حجاب، تہذیب و ترقی کا مرغا آٹھوں پہر ککڑوں کوں بولا کرے۔ یعنی پہلے تو سور کا گوشت بجائے بکری وغیرہ کے بیچا جائے اور پھر شراب بوتلیں کی بوتلیں بلا قیمت مفت تقسیم ہوا کریں اور جس قدر بکریاں ملیں سب مول لے کر سوروں سے بدل لی جائیں۔ پرانے مسلمان غلہ کھاتے کھاتے اکتا ہی جائیں گے عید بکرید پر یہی جانور ذبح کریں گے بس ان دونوں چیزوں کے استعمال سے غیرت اور حجاب دونوں کافور ہو جائیں گے اور پھر بے پردگی پر نہ کوئی جھگڑا ہوگا نہ مقدمہ قتل و خون

دائر ہوگا اور کام بھی بلا خدشہ جاری ہو جائے گا۔''[1]

سر سید تحریک آزادی نسواں و تعلیم اور ''نئی روشنی'' کا خاکہ اڑانے کے علاوہ انھوں نے معاشرہ کی عام خرابیوں اور نقائص کو بھی طشت از بام کیا ہے۔ شراب، افیم، کوکین، بھنگ، چرس اور چانڈو جیسی منشیات کا استعمال جو اس عہد میں لکھنؤ کے اکثر عوام و خواص کا مشغلہ تھا منشی سجاد حسین کا موضوع سخن رہا۔ لیکن اس پر سنجیدگی سے روشنی ڈالنے یا ان کے نقصانات شمار کرانے کے بجائے انھوں نے ان مناظر کی قہقہہ خیز مصوری کی ہے جو ان اشیاء کے استعمال کے بعد شائقین حضرات اور ان کے متعلقین سے وابستہ ہو سکتے ہیں۔ افیونوں کی بیویوں کی کتنے پر لطف طریقہ سے پینکی کا مذاق اڑاتے ہیں اور سب کچھ کہہ جانے کے باوجود نصیحت یا وعظ کی تہمت اپنے سر نہیں لیتے:

''آپ سچ جانیے اپنی آنکھوں کی قسم جنم جلی جشن چینی بیگم نے ہم لوگوں کا کھوج کھویا ہے۔ وجہ کیا ہمارے گھر والے اس کو پیتے ہی دنیا کے کسی کام کے نہیں رہتے، گھر کی فکر نہ بچوں کی پرواہ دس بارہ بجے تو سو کے اٹھیں گے، گھنٹہ دو گھنٹہ تک نیند کے خمار میں اونگھا کریں گے پھر اونگھنا بھی وہ جس کے ہر جھونکے میں پلنگ پر سے جھکتے جھکتے پٹی کے زمین سے سر لگ جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ میاں پینک میں نہیں اپلوں کا کوئی ٹوکرا رکھ دیا ہے۔ پھر بہزار خرابی چیخنے چلانے دو ہتھڑ مارنے سے جز بز او ٹھے اور غصے کے زور میں جا ضرور جو جاتے ہیں تو بارہ بارہ چوبیس برس تک نکلنے کا نام نہیں لیتے۔ پکارتی ہوں خوشامد کرتی ہوں کوسنے دیتی ہوں میاں کو سانپ سونگھ گیا، چھچھوندر گھسیٹ لے گئی، جب اچھی طرح چٹوا صف ماتم کی نوبت آ گئی میکے والوں کو رنڈ سالے کی فکر ہوئی تو بڑی بڑائی ایک مبہین سی آواز میں منمنائے ہوں کر دی۔ خیر دم میں دم آیا سلامتی سے میاں جیتے ہیں۔ خیر

---

[1] اودھ پنچ: ۱۱ر اکتوبر ۱۹۰۰ء

خدا کر کے قبض سے ان کی جان کیا چھوٹی جائے ضرور کو انھوں نے چھوڑا پھر اب حقہ بھرنے کی خود ہی فکر ہوئی۔ صاحب کسی سے چلم مرضی کے موافق بھری ہی نہیں جاتی خیر خدا کر کے اس سے بھی نجات ہوئی تو افیون کے گھولے میں پڑے پھر سے صاحب بہت نہیں ایک ریوڑی ایک گنڈیری کے دو تین ٹکڑے یا کھیر کا پیالہ ضرور ہوا چاہیے۔ دن ٹھہرا بوند سا اسی میں شام ہوگئی اب نوکری چاکری کمائی کجائی کی مہلت کس کو۔ بال بچوں گھر بار کے کام کاج کون کرے ان کو تو جو کچھ فکر ہے اپنی افیون اور گزک کی رات کا مشغلہ صرف حقہ بھرنا کوئے چراغ یا دیا سلائی سے سلگانا اور بہت سہولیت نہایت نزاکت سے حقے کے کش کھینچنا۔ بات کو کون بڑھائے ساری رات جاگتے ہیں مگر جب دیکھو سر تلے ٹانگیں اوپر اگر میں نے ایسا ہی اصرار کیا اور کسی کام کے واسطے بازار بھیجا تو دوکان پر کھڑے کھڑے وہیں رات بسر ہوگئی۔''[1]

سماجی مضامین کے ضمن میں عید، بقرعید، شبرات، محرم، ہولی، دیوالی، بسنت اور کرسمس وغیرہ تہواروں پر لکھے ہوئے مضامین بھی قابل ذکر ہیں یہ مضامین بھی خالص ظرافت کا نمونہ ہیں۔ ان کا مقصد اصلاح نہیں البتہ جب وہ لکھنؤ کے مخصوص معاشرے اور اس مخصوص معاشرے کے منفرد کردار یا رسم و رواج کی مرقع کشی کرتے ہیں تو ظرافت کے پیرائے میں ان مخصوص خامیوں کو اجاگر کر دیتے ہیں جن کو سماجی مصلحین اپنی تحریر و تقریر کا موضوع بنا کر پیش کرتے ہیں۔ دراصل سجاد حسین نے معاشرے کی اصلاح کے جو مطالبات پورے کرنے کی کوشش کی ہے اس میں انھوں نے ہمیشہ یہ بات ملحوظ رکھی کہ قاری اصلاحی مقصد میں چاہے ان کا ہمنوا ہو نہ ہو مضامین میں ضروری دلچسپی محسوس کرے اور سجاد حسین کا یہ طریقہ کار نام نہاد مصلحین کی کوششوں سے کہیں زیادہ بارآور ثابت ہوا۔

---

[1] اودھ پنچ: ۸ر مئی، ۱۹۰۲ء

## ادبی وتنقیدی مضامین

اودھ پنچ کے مدیر کی حیثیت سے اکثر وہ اپنے مضمون نگاروں کی موافقت یا مخالفت میں قدم اٹھاتے تھے انھوں نے بعض ایسے مضامین لکھے جن میں ظریفانہ لطافت کے ساتھ ساتھ جا بجا تنقید کا لطف بھی موجود ہے۔ یہ مضامین نہ صرف اعلیٰ درجہ کی ظرافت کا نمونہ ہیں بلکہ ادبی وتنقیدی اعتبار سے بھی ان کا پلہ بھاری ہے۔ خصوصاً چند مضامین تو ابتدائی فن تنقید کا اچھا نمونہ کہے جاسکتے ہیں۔

اودھ پنچ سے کچھ ادبی ہنگامے بھی وابستہ ہیں۔ اس اخبار کے صفحات میں شاعری اور زبان کے متعلق زبردست بحث ومباحثے ہوئے ہیں ان مباحثوں میں رکاکت کے باوجود ادبی اور تنقیدی شان پائی جاتی ہے اور چونکہ ان معرکہ آرا مباحثوں کا سلسلہ برسوں چلتا رہا اور ملک کے تمام اہل قلم ان میں شریک ہوئے یہ ناممکن تھا منشی سجاد حسین ان علمی مباحثوں سے اپنا دامن بچائے رکھتے۔ اودھ پنچ کے یہ معرکے رتن ناتھ سرشار، مولانا حالی، نواب مرزا خاں داغ، مولانا عبدالحلیم شرر اور علامہ اقبال کے درمیان ہوئے لیکن جس معرکے میں منشی سجاد حسین نے دل کھول کر حصہ لیا اور اپنی انشا پردازی علمی قابلیت اور ظرافت کے جوہر دکھائے وہ شرر اور چکبست کا معرکہ ہے۔ اس جھگڑے کی اصل نوعیت یہ تھی کہ ۱۹۰۵ء میں مثنوی گلزار نسیم کا ایک نیا ایڈیشن نڈت برج نرائن چکبست نے تصحیح اور ترتیب کے بعد مصنف کے اصلی ایڈیشن کے مطابق شائع کیا اور ابتداء میں ایک بسیط دیباچہ بھی لکھا جس میں پنڈت دیا شنکر نسیم کے حالات زندگی اور ان کی شاعری پر بحث کی گئی تھی۔ مثنوی کے بعد پنڈت دیا شنکر نسیم کے دیوان کا کچھ انتخاب بھی شامل تھا۔ ''دلگداز'' بابت ماہ مارچ اور اپریل ۱۹۰۵ء میں مولوی عبدالحلیم شرر نے اس نئے ایڈیشن کا ریویو شائع کیا جس میں نہ صرف گلزار نسیم کی زبان اور شاعری پر اعتراضات کیے بلکہ اس مثنوی کو آتش سے منسوب کردیا۔ مزید برآں چکبست کو بھی تصرف بے جا اور توہین اساتذہ کا ذمہ دار ٹھہرایا اس جواب میں منشی سجاد حسین نے ایک مضمون ''نسیم کی رنگین

بیانی اور حضرت شرر کی شرر فشانی'' کے عنوان سے ۱۱ر مئی ۱۹۰۵ء کو اودھ پنچ میں شائع کیا جس میں چکبست کی تائید اور شرر کے اعتراضات کا جواب دیا گیا۔ شرر کے بہی خواہوں نے اس مضمون کو کسی اور کا مضمون کہہ کر خوب خاکہ اڑایا اور صاحب مضمون کو فاتر العقل اور جاہل وغیرہ کے خطابات سے نوازا۔ منشی سجاد حسین نے ان بے ہودہ کلمات کو نظر انداز کر دیا البتہ چکبست نے جولائی ۱۹۰۵ء (اردو معلّٰی) اور ۱۷ر اگست ۱۹۰۵ء (اودھ پنچ) میں دلگداز کے اعتراضات کا جواب بڑی تحقیق و جستجو کے بعد دیا جس میں اساتذہ کے کلام کو دلیلوں کے طور پر استعمال کیا گیا تھا۔ تاہم شرر کی تائید اور منشی سجاد حسین و چکبست کی مخالفت میں ''پیام یار'' اور ''ریاض الاخبار'' میں بدر کے فرضی نام سے بے ہودہ اور فحش مضامین شائع ہوئے جن کو شرر نے سراہا اور صاحب مضمون کو مکرم و محترم، دوست کے القاب سے یاد کیا پھر کیا تھا اودھ پنچ کی بارود میں چنگاری جا پڑی۔ اس کے مضمون نگاروں نے وہ دندان شکن جواب دیئے کہ حالی کی طرح مولانا شرر کا بھی حال ابتر ہو گیا۔ شرر کے ایک ایک حرف اور ایک ایک جملے پر اعتراضات کیے گئے، ان کی ناول نویسی، شاعری اور مولویت کا مضحکہ اڑایا گیا۔ حد یہ ہے کہ مولوی شرر پر ذاتی حملے بھی کئے گئے جس کا جواب الجواب بھی شرر اور ان کے ساتھیوں نے اسی فحش انداز میں دیا منشی سجاد حسین کو ''شہوہ'' اور ہندو حضرات کا طرفدار بتایا اودھ پنچ میں جوابی کارروائی کا یہ سلسلہ اور اعتراضات کا یہ سلسلہ ''خاں صاحب کی فریاد'' ''جنت کی ڈاک'' ''بدر النسا اور اس کی مصیبت'' کے عنوان سے مہینوں تک چلتا رہا۔

اس معرکہ میں منشی سجاد حسین کے جو مضامین اودھ پنچ میں شائع ہوئے ہیں وہ کئی لحاظ سے اہم ہیں اولاً منشی صاحب کے یہ مضامین قومی اور مذہبی تعصب سے بالکل پاک صاف ہیں۔ ثانیاً بے جا غیظ و غضب اور بغض و حسد کے جذبات سے مبرا ہیں وہ بے جا جوش میں کہیں بھی اپنے مخالفین کے لیے ایسے الفاظ استعمال نہیں کرتے جو ذوق سلیم پر گراں ہوں۔ اس شائستہ تنقید میں ایسی ظریفانہ شوخی موجود ہے جس کو ظرافت آمیز تنقید کا ایک اچھا نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ اودھ پنچ ۱۱ر مئی ۱۹۰۵ء کو ایک مضمون بہ عنوان ''نسیم کی

رنگین بیانی اور حضرت شرر کی شرر فشانی'' میں مولانا شرر کے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مولانا کی نظر ایسی دقیق واقع ہوئی ہے کہ جو نکتے تنقید گلزار نسیم میں لکھے گئے ہیں وہ معمولی سمجھ کے آدمی کو مجذوب کی بڑ سے زیادہ قریب الفہم نہیں معلوم ہوتے مثلاً مولانا کا ارشاد ہے کہ گلزار نسیم ایسی نظم ہے کہ اس کے پایہ کی نظمیں اردو میں دو چار ہی ہوں گی مگر اسی مقام پر پھر فرماتے ہیں کہ غلطیوں کے لحاظ سے اس سے بدتر نظم اردو میں نہ ملے گی اور پھر فرماتے ہیں کہ اردو شاعروں کا یہ طریقہ رہا ہے کہ جس کلام میں ایک غلطی نکل آتی ہے اس کی تمام خوبیاں اس ایک لغزش پر قربان کر دیتے ہیں مگر گلزار نسیم کو باوجود اس قدر معائب کہ جن کی نظیر اردو نظموں میں کم ملے گی اس قدر شہرت حاصل ہے یہ اجتماع ضدّین واقعی میں سمجھ میں نہیں آتا یہ تو وہی ہے جیسے کہ صوفیوں اور ویدانتیوں کے مقولے ہیں کہ سب کچھ ہے اور کچھ نہیں دنیا ماتم سرا بھی ہے اور عشرت سرا بھی ہے مگر اس سب کا ایک مطلب تو صاف ہے کہ گلزار نسیم کی نسبت جو مولانا کو سوجھی ہے وہ آج تک کسی کو نہیں سوجھی۔''[1]

مولانا شرر نے گلزار نسیم کے خاص خاص اشعار پر بھی اعتراضات کیے ہیں۔ سجاد حسین نے اس مضمون میں چند اعتراضات کا جواب بھی دیا ہے۔ دو اعتراضات اور ان کے جوابات مندرجہ ذیل ہیں:

''.....مولانا فرماتے ہیں کہ نسیم کا یہ مصرعہ ہے کہ ''شادی کو کیا حیا اٹھا کر'' قابل اعتراض ہے۔ کیوں صاحب یہ محض اس لیے کہ ''حیا اٹھا کر'' کوئی معنی نہیں رکھتا آپ کے نزدیک ''پردہ حیا اٹھا کر'' ہونا چاہیے۔ سبحان اللہ کیا اعتراض ہے ''حیا اٹھانا'' ''حیا اڑا دینا'' ''حیا اٹھ جانا'' یہ لکھنؤ کی فصاحت زبان ہے اور شعرائے اردو کلام میں اس محاورہ کی متعدد مثالیں مل جائیں گی۔ برعکس اس کے دیہات وغیرہ میں ممکن ہے ''پردہ حیا

---

[1] اودھ پنچ: ۱۱ر مئی، ۱۹۰۵ء

اٹھا کر'' مع اضافت بولتے ہوں۔لکھنؤ کا روز مرہ ''حیا اٹھانا'' ''شرم اٹھانا'' عام محاورہ ہے۔امیر مینائی فرماتے ہیں ۔

کچھ تیری شرم نہیں کہ اٹھا بھی نہ سکوں

مولانا کہیں گے کہ یوں ہونا چاہیے تھا کہ'' کچھ تیرا پردہ شرم نہیں ہے کہ اٹھا بھی نہ سکوں'' ہماری رائے میں چونکہ مولانا پردے کے سخت خلاف ہیں لہٰذا ان کو موقع بے موقع پردہ اٹھانے کی فکر لاحق رہتی ہے۔مولانا فرماتے ہیں'' جانی'' کا لفظ سوا معشوقہ کے اور کسی کے شان میں اور بھی خلوت کے سوا دیگر موقعوں پر استعمال کرنا بدتمیزی ہی نہیں بلکہ غلطی ہے۔مگر روح افزا تاج الملوک سے پہلی ہی ملاقات میں کہتی ہے کہ'' تجھ پاس تو اک عصا ہے جانی'' ہم مولانا سے صرف اس قدر پوچھتے ہیں کہ'' ابا جانی'' جو لکھنؤ کا عام محاورہ ہے اس کی وجہ کیا ہے؟ کیا معشوقہ کو ابا بھی کہتے ہیں اور خلوت میں کہتے ہیں کہ جلوت میں بہر حال لکھنؤ کی زبان تو یہی ہے دیہات کا حال آپ جانیں۔''[1]

اتحاد یکم اگست ۱۹۰۵ء میں مولانا شرر نے منشی سجاد حسین کو شہدے کا خطاب عطا فرمایا۔منشی سجاد حسین نے ۱۰/اگست ۱۹۰۵ء کو ایک مضمون ''اودھ سے شتر مرغ'' شائع کیا جس میں تلخ جواب نہ دے کر طنز و ظرافت کا پیرایہ اپنایا۔

جو منھ میں یار کے آتا ہے بک جاتا ہے اے آتش
نہ الٹی ہی سمجھتا ہے نہ وہ رشک قمر سیدھی

اس مرتبہ اتحاد میں جناب مولانا عبدالحلیم شرر خادم قوم ادیب نکتہ پرور سابق پردہ عصمت و ایڈیٹر حال دلگداز و اتحاد ایڈیٹر مستقل المورخ و ایڈیٹر مستور العرفان و مصنف

---

[1] اودھ پنچ: ۱۱/مئی، ۱۹۰۵ء

(بدالنساء کی مصیبت) نے ہم کو شہدے کا خطاب دیا ہے۔ عمرت دراز باد۔ اور یہ محض اس گناہ پر کہ ہم نے نسیم لکھنوی کی مشہور مثنوی گلزار نسیم پر ہٹ دھرمی تعصب مذہبی سے لبریز مولوی شرر کے اعتراضات لایعنی کی منصفانہ تردید کی جسارت کی ہزار شکر ہے کہ ہم نہ گندہ دہن مولوی ہیں نہ سہ مست بادہ ریاکاری ورنہ شہدے ہوتے اب خوب ہے کہ کسی روز مولانا شرر وضو کر کے سہو وسکر میں اللہ میاں سے نہ معرافعہ کریں تو ہم کیا کریں گے۔ ہم تو سمجھتے ہیں اودھ پنچ میں جو مضامین نکل رہے ہیں ان کے جواب دینے کی اگر جرأت کی گئی تو ظرافت و لطافت کے پیرائے میں جودت دکھائی جائے گی مگر مولانا نے اپنی خلقی بسورتے ہوئے مذاق کے مطابق جواب دیا۔

بدم گفی و خور سندم عفاک اللہ نگو گفتنی

مولانا شرر نے بھی پر درد ہو کر پنچ کے تمام مضامین کا جواب گلزار نسیم کا سا اختصار مدنظر رکھ کر ایک لفظ میں دے دیا۔ مولانا کے اور بہت سے اوصاف تو معلوم تھے مگر یہ نہ معلوم تھا کہ سلامتی سے مولانا لجالو سرشت معشوق مزاج بھی ہیں اور ذرا سی چھیڑ میں بگڑ کے روٹھ جاتے ہیں۔ اچھا ہوا شاہی نہوئی ورنہ ہمیں شہر چھوڑنا پڑتا پھر اور تو ہم سے کچھ نہ بن پڑتا ''سیدھے حیدرآباد چلے جاتے'' کیا کہیں مولانا کی یہ ادا ہمیں رہ رہ کر یاد آتی ہے کہ ہائے کس انداز سے کہتے ہیں کوئی اور صاحب دخل نہ دیں ہم اور منشی سجاد حسین نپٹ لیں گے یہ (ہم) تو دل میں کھپ گیا واقعی اس میں بھی ایک ادا نکلتی ہے۔

عرب کے ملک میں دیکھے بہت شتر غمزے
پر ایک اونٹ میں پائی نہیں ادا تیری[1]

---

[1] اودھ پنچ: ۱۰ر اگست ۱۹۰۵ء

## منشی سجاد حسین کے متفرق مضامین

سجاد حسین کے مضامین کی فہرست بہت لمبی ہے۔ ان میں ''لوکل علیہ الرحمۃ'' ''موافقت زمانہ'' ''پنچ مل خدا خدا مل پنچ'' ''نوٹس'' ''تار برقیاں'' ''چہ میگوئیاں'' ''بے تکی'' ''لفظی نمائش گاہ'' ''پولیٹکل نماز کی اہمیت'' ''اس مضمون کو پڑھ کر آئینہ ضرور ملاحظہ کر لیجئے گا'' ''کتب جدید'' ''نیچر کا مارشل لا'' ''انڈے بچے والی چیل چلباز'' ''مٹی خراب خلق میں مہرووفا کی ہے'' ''بازیچۂ اطفال ہے دنیا میرے آگے'' ''سہل للکہ'' عنوانات کے تحت شائع ہوئے ہیں۔ ان میں سے بعض عنوانات مستقل تھے اور بعض ہنگامی یا عارضی نفس مضمون کے اعتبار سے ان مضامین کا دائرہ نہایت وسیع ہے۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں بچا ہے جو موضوع سخن نہ بنا ہو۔ لیکن یہاں پر ان میں سے چند مضامین قابل ذکر ہیں۔

موسمی تبدیلیوں اور شہر خاص کی خبروں پر ''لوکل علیہ الرحمۃ'' کے عنوان سے جس انداز میں تبصرہ و تذکرہ ہوتا تھا مثال کے طور پر دو اقتباس مندرجہ ذیل ہیں:

> ''سردی پڑنے لگی کلابی کیا معنی اچھے خاصے چہچہاتے گڑہل کے رنگ کی نہایت مزے دار جاڑے ہوگئے ہیں۔ باغات کشمیر سے مالیدہ کی باری آئی، شربتی ململ تنزیب کا چلن اٹھا تو شک، لحاف، رزائی، دگلہ، لبادہ اور کوٹ صندوقوں سے نکلے۔ ادھر دھنوں نے دھویں دھویں شروع کی ادھر جاڑوں کی ٹنگار مونگ پھلی کی پکار کی آواز کان میں پہنچی۔ بارے کا ملیدہ مزہ دکھانے لگا۔ انڈے، گاجر کے حلوے کی فصل ہے۔ شہر کی خبریں سرد ہیں، ادھر مرغابیاں جاڑا لے لے پہاڑوں سے اتریں ادھر حکام نے خروج کیا۔ بیگاریوں کی پکار مچی۔''[1]

---

[1] اودھ پنچ، جلد:۱۹، ۲۵ر جولائی ۱۸۹۵ء

## شہر کی خبروں میں سب سے گرما گرم خبر یہ ہے:

''ہیضہ خاں صاحب مصروف کاروبار ہیں۔ امین آباد، گولہ گنج سے ہیڈ کوارٹر اٹھ کر چوک کی طرف آیا ہے۔ ہفتہ وار سو سوا سو سے زیادہ کی کارگزاری ہو جاتی ہے اگر ان حضرات کا روسی ہیضوف رکھا جائے تو بہت مناسب ہو کیا وجہ روس کی طرح پہاڑ، دریا، صحرا سب نانگتے پھاندتے چلے آتے ہیں پھر عجلت مزاج میں اس بلاک کی دم بھر میں کوسوں تک صفایا، سفا کی اس بلا کی بچہ بوڑھا، جوان عورت مرد سب کو ایک ہی لاٹھی ہانکنا جس طرح وسط ایشیا میں روس ریل تار وغیرہ لیے ڈبل کوچ چلا آتا ہے اس طرح یہ بھی کفن وکافور ہمراہ لاتے ہیں۔''[1]

## پولیٹکل نماز کی نیت:

گورنمنٹ آف انڈیا.....آنکھیں برابر کے جدھری ہماری قوم کا بھلا ادھر ہمارا منھ..... اللہ اکبر

سید احمد خانصاحب.....آنکھیں بند کر کے جدھر لاٹ صاحب کا منھ ادھر ہمارا منھ..... اللہ اکبر

مسلمان لوگ.....آنکھیں بند کر کے جدھر بڑے میاں کا منھ ادھر ہمارا منھ..... اللہ اکبر

راقم اللہ اکبر[2]

مضمون میں نماز کی نیت کے الفاظ کو جو مسلمان ہمیشہ اپنی نمازوں میں استعمال کرتے ہیں تحریف کر کے خوب مزاح کا سامان پیدا کیا ہے۔ مزاح کے ساتھ ساتھ گورنمنٹ آف انڈیا (برٹش گورنمنٹ) کے استحصال کے پالیسی پر بے باکی سے طنز کیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ سر سید احمد خاں جو گورنمنٹ کے سچے بہی خواہ

---

[1] اودھ پنچ، جلد:۱۱، ۲۸/اگست ۱۸۸۹ء

[2] اودھ پنچ: ۲۲/مارچ ۱۸۸۸ء

سمجھے جاتے تھے اس طنز کے وار کی زد میں آ گئے۔ ''آنکھیں نیچی کر کے ان کا لاٹ صاحب کے پیچھے نماز پڑھنے کی پھبتی بڑی معنویت رکھتی ہے۔ یہاں ایک اور بات قابل ذکر ہے کہ لات بجائے ''لاٹ'' لکھ کر انگریزوں کے حکمراں طبقہ پر جو لاٹ صاحب کہلاتا تھا طنز سے بڑھ کر زہرناکی کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس طنز کے وار نے جس تیسری چیز کی خبر لی ہے وہ ہندوستانی مسلمان ہیں۔ سرسید کی بے لوث خدمات اور انتھک کوششوں سے قوم کی ایک بڑی تعداد ان کو اپنا رہنما اور مصلح تسلیم کرنے لگی تھی۔ اودھ پنچ کی یہ پالیسی رہی ہے کہ وہ سرسید احمد خاں یا علی گڑھ تحریک کی ہمیشہ جانچ کرتا رہے۔ ان کے ہر خیال کو بلا چون چرا قبول کرنا اور ان کی ہر بات پر ایمان لانا اس اخبار کو پسند نہ تھا اس لیے ہندوستانی مسلمانوں پر یہ طنز کیا کہ وہ آنکھیں بند کر کے سر سید احمد خاں کی اتباع کرتے ہیں۔

## اس مضمون کو پڑھ کر آئینہ ضرور ملاحظہ کر لیجئے گا:

''ایک شہر میں سب لوگ نکٹے تھے وہاں کسی وجہ سے پیدائش ہی چند روز سے ایسی ہونے لگی تھی کہ ناک کٹی ہوتی لیکن تھے وہ لوگ قومی اور ہنرمند اور ذی علم صرف قوت شامہ سے کسی قدر بے بہرہ تھے اور اس کو کوئی نقص نہ جانتے تھے۔ اتفاقاً ایک جماعت کا وہاں گذر ہوا۔ میں بھی ان میں تھا وہاں کے لوگوں نے بہ سبب اس کے کہ ہمارے چہروں پر ناک تھی ہم کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنا شروع کیا اور ہم کو اپنے ملک میں بہت ذلت سے رہنے دیا۔ حقیقت میں انھوں نے ہم کو ایک جانور مشابہ بہ انسان سمجھا۔ چند روز تک تو ہم لوگ سخت پریشان رہے کہ یا الٰہی ناک ایسی چیز اس شہر میں معیوب اور باعث ذلت و تکلیف سمجھی جاتی ہے، لیکن خیر کسی طرح دن کاٹتے تھے۔ صرف یہی خوشی تھی کہ وہاں طلائی برتنوں میں کبھی کبھی غلیظ بھی کھا لیتے تھے، ہم لوگ اگرچہ مٹی کے برتنوں میں کھاتے تھے

لیکن پاک اور نجس میں امتیاز کرتے تھے۔ تاہم ہم لوگوں میں تدبیریں سوچی جاتی تھیں کہ کیوں کہ ان قوی آدمیوں میں عزت پیدا کریں کیوں کر ان کو یقین دلائیں کہ یہ عمدہ چیز ہے تم خود بے نصیب ہو۔ لیکن کوئی تدبیر نہ آتی تھی۔ تھوڑے دن نہ گزرے تھے کہ ہماری جماعت میں سے ایک بوڑھے آدمی نے یہ مشورہ دیا ہم سب لوگ بھی ناک کٹوا ڈالیں اور پھر ان کے برابر ہو جائیں۔ آپ جانیے اس خیال پر بڑی انگیختی ہوئی اور اس بوڑھے کی عقل پر سب نے تقریریں کیں۔ لیکن اس بوڑھے نے نہایت شدومد کے ساتھ کہنا شروع کیا کہ ناک حقیقت میں چہرے کی سطح ناہموار کر دینے والی چیز ہے۔ یہ خیال کہ اس سے چہرے کا حسن ہے محض ایک وہم ہے۔ صرف ایک نشانی ہے اور یہ بلند لوگوں نے صفائی کے تعصب آمیز خیال سے اپنے رخساروں کو مل مل کر اور دبا دبا کر خواہ مخواہ پیدا کر لی ہے۔ یہ کہہ کر ان حضرات نے تو بے تکلف اپنی ناک کٹوا ڈالی اور بے شک اس کا یہ اثر ہوا کہ اس کی نہایت عزت اس قوم میں ہونے لگی اور وہ بخوبی نکٹوں میں مل گیا البتہ اس کے تازہ زخم نے اس کو قوم سے کس قدر علیحدہ کر رکھا تھا لیکن وہ بوڑھا ہمیشہ ناک رگڑا کرتا تھا کہ رہا سہا نشان بھی مٹ جائے اب تو بعض ناک والے بھی اس کی عزت دیکھ کر کٹوانے پر راغب ہوئے۔ صرف یہ خیال مانع تھا کہ نجاست اور پاکی میں بہ اعتبار بو کے امتیاز باقی نہ رہے گا لیکن وہ بوڑھا باوجود بنی بریدہ ہونے کے نجس اور پاک میں کسی قدر امتیاز کر لیتا تھا اس سبب سے لوگوں کو اطمینان ہو گیا اور ایک اچھی خاصی جماعت ناک کٹوانے پر علانیہ تیار ہو گئی اور نہایت شدومد سے اس جماعت کے لوگوں نے کہنا شروع کیا کہ یہ خیال بالکل غلط ہے کہ ناک نہ ہونے سے اچھی بری بو کا امتیاز باقی نہیں رہتا۔''[1]

---

[1] اودھ پنچ: ۱۳ر مئی ۱۸۸۴ء

منشی سجاد حسین اس مضمون میں قصہ کی مدد سے اپنے خیالات کو ضبط تحریر میں لائے۔ قصے اور کہانیاں ہمیشہ ادب میں بڑی دلچسپی سے لکھے اور پڑھے جاتے ہیں۔ پند و نصائح کے لیے قصوں کی بڑی اہمیت ہے۔ سجاد حسین نے اپنے تخیل کی مدد سے ایک مزاحیہ قصہ تراشا ہے اور مذہبی بے راہ روی پر خوب طنز کیا ہے۔ مضمون کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اس زمانے میں مذہب کی عقلی تعبیروں کی وجہ سے بحث و مباحثہ کا دور دورہ تھا۔ خاص طور پر سرسید احمد خاں کے مذہبی خیالات سے اکثر علماء کو اتفاق نہیں تھا۔ اس مضمون میں ایسے افکار کے خلاف جو مذہبی مسائل میں من مانی کرنے لگے تھے طنز کے تیر برسائے ہیں۔

## نیچر کا مارشل لا:

''بھئی واہ قانون قدرت کو دیکھیے کیا افراط و تفریط کمی زیادتی نکالی ہے میزان عدل کے پلے ہیں کہ بے ایمان بنیے کے دل کی طرح ڈھیکلی بات کرتے ہیں نیچے کو جھکا تو تحت الثریٰ سے بھی پلے پار، اوپر کو اٹھا تو گنبد گردوں پر چتر بن گیا۔ چھتر منزل کی کیفیت دکھادی۔ ایک دفعہ لڑکیاں پیدا کرنے کا وہ طوفان کہ جدھر دیکھیے ایک ایک دو دو کی جگہ چار چار ایک شیمے میں ملفوف بیرنگ چلی آتی ہے ہر حاملہ آدمی کیا چوہے کی اولاد ہوگئی اس کثرت و ارادت کو دیکھ کر مرد بیچارے لگے چوہیا کا بل ڈھونڈنے اور اسی طرح گھبرانے جیسے ریاست دکن میں ہندوستانیوں کے جانے سے دکنی بھائی مارے گھبراہٹ کے عورتوں کے عوض انھیں کے پیٹ میں چوہے گھس گئے۔ اس طوفان نسائی کا دیکھیے کیا انجام ہو۔ حقوق چھن جانے اور حکومت قوامونی کا فور ہوجانے کا دھڑکا تو یورپ اور امریکا کی ترقیاں دیکھ دیکھ کر مدت سے دامنگیر حال تھا اب اس خلقی بھرمار سے اور بھی رہے سہے حواس پیترے ہوئے۔ بارے کب تک ایک دفعہ پھیر بدل جو ہوتا ہے تو عزرائیل

نے بھی انھیں کی جانب نظر توجہ فرمائی۔ اب کی سال میں بچہ کیا رہا، ملک الموت حلول کر گئے۔ جان سولی پر ہوگئی۔ زچہ کیا بچی گویا بچے کے ساتھوں ساتھ خود بھی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئی اور جو گئی تو قصہ پاک۔ حکیموں کا قول ہے کہ کارخانہ قدرت میں جب کوئی چیز اپنی نسل پیدا کرتی ہے تو اس میں اپنی جان ڈالی دیتی ہے۔ بہت سے حیوان اور نباتات ایسے ہیں کہ بروقت بچہ پیدا ہونے اور پھل پک جانے کے مرجاتے ہیں۔ ایک دفعہ پھل لانے والے درختوں یا ایک بچہ جننے والے جانوروں سے ثبوت کامل ملتا ہے پس اس طرح انسان بھی اپنی جانی قومی کے مطابق اپنی اولاد کو دیتا ہے۔''[1]

غرض یہ کہ منشی سجاد حسین نے اودھ پنچ میں بطور ایڈیٹر سیاسی وسماجی وادبی وتنقیدی مضامین کے ذریعہ اس دور کی عکاسی طنزیہ انداز میں کی ہے۔ انھوں نے مغربی تہذیب وتمدن اور سیاسیات کی خامیوں کو اجاگر کرنے کے لیے مغربی ہتھیاروں کا ہی سہارا لے کر ایسے معرکۃ الآراء مضامین لکھے جو یادگار زمانہ بن گئے ہیں۔

---

[1] اودھ پنچ مطبوعہ، ۷/اگست ۱۹۹۶ء

# باب سوم

## اودھ پنچ کے تہذیبی سروکار دیگر قلم کار کے حوالے سے

۱ اکبر الہ آبادی

۲ پنڈت رتن ناتھ سرشار

۳ مرزا مچھو بیگ ستم ظریف

۴ پنڈت تربھون ناتھ ہجر

۵ نواب سید محمد آزاد

۶ مولوی سید عبدالغفور شہباز

۷ منشی جوالا پرشاد برق

۸ منشی احمد علی شوق

۹ مولوی احمد علی کسمنڈوی

## اودھ پنچ کے دیگر قلم کار

اودھ پنچ کی ترقی اور مقبولیت کا راز اس کے ایڈیٹر منشی سجاد حسین کی ہمہ جہت شخصیت میں مضمر تھا۔ منشی سجاد حسین فطری طور پر ذہین اور فطین واقع ہوئے تھے۔ وہ پر مذاق مزاج کے مالک تھے، انھوں نے اپنے گرد ایسے ادیبوں اور شاعروں کو جمع کیا جنھوں نے اپنی تخلیقات سے اودھ پنچ کو چار چاند لگا دیئے۔ ان میں سجاد حسین کے علاوہ اکبر الہ آبادی، پنڈت رتن ناتھ سرشار، مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، پنڈت تربھون ناتھ ہجر، نواب سید محمد آزاد، مولوی سید عبدالغفور شہباز، منشی جوالا پرشاد برق، منشی احمد علی شوق اور مولوی احمد علی کسمنڈوی کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

اودھ پنچ اردو مزاحیہ ادب کا وہ اولین پڑاؤ ہے جس میں مزاح نگاروں نے شعوری طور پر اپنی تخلیقات میں مزاح پیدا کرنے کی سعی کی۔ گو ان کی کوششیں کچھ زیادہ بارآور ثابت نہ ہوئیں اور شعوری طور پر مزاح پیدا کرنے کی کوشش میں وہ مزاح کو بہت حد تک پھکڑ پن کی حدوں میں لے گئے۔ لیکن بعد کے مزاح نگاروں نے بھی جب شعوری طور پر مزاح کو نثر و نظم میں برتنے کی کوشش کی تو وہ اودھ پنچ والوں کی خامیوں سے پوری طرح باخبر تھے۔ وہ ان خامیوں سے دامن بچا کر چلے تو ان کی مزاح نگاری خالص مزاح سے بہت حد تک روشناس ہوتی چلی گئی۔ بہر حال، رہبر تو اودھ پنچ ہی ہے حقیقتاً اودھ پنچ ہی ہمارے مزاحیہ ادب کی روایت کا اولین رکن ہے۔

اودھ پنچ کے قلمی معاون کی حیثیت سے اکبر الہ آبادی ایک سنگ میل کا درجہ رکھتے ہیں۔ اکبر کی شاعری کی ابتدا سنجیدہ کلام سے ہوئی لیکن اودھ پنچ سے وابستہ ہو جانے کے بعد اکبر نے اردو ادب میں طنزیہ اور مزاحیہ شاعری کی بنیاد ڈالی اور زمانے سے لسان العصر کا خطاب حاصل کیا۔ اگر وہ نثر کی طرف رجوع ہوتے تو یہاں بھی اپنی اجتہادی روش کا قابل قدر نمونہ چھوڑتے مگر افسوس کہ نثر کی طرف انھوں نے کوئی توجہ

نہیں دی۔ یوں تو اکبر نے سیاسی، سماجی، ملکی، مذہبی، غرض شخصی زندگی کے ہر پہلو اور ہر گوشے کو ہدف طنز و مزاح بنایا لیکن ان کی طنز وظرافت کا اصل نشانہ مغربیت ہے۔

اکبر کے عہد کا بہترین خاکہ مولانا عبدالماجد دریا آبادی کا وہ حصہ مضمون ہے جو رسالہ اردو بابت ماہ اپریل ۱۹۲۳ء میں شائع ہوا ہے۔[1] موصوف نے جس خوبی، بصیرت اور بلند آہنگی سے حالات اور واقعات کا مرقع کھینچا ہے اس کا یہاں تذکرہ ناگزیر ہے۔ ان کو مدنظر رکھ کر لسان العصر کے شاعرانہ کمال کا اندازہ لگانا آسان ہوگا:

''اکبر کی شاعری کی نمود وترقی کا زمانہ انیسویں صدی کا ربع آخر اور بیسویں صدی کا خمس اول ہے۔ یہی زمانہ ہندوستان میں مغربی اخلاق، مغربی معاشرت، غرض مغربیت کے انتہائے عروج وشیوع کا ہے۔ اکبر جب دنیا سے روشناس ہوتے ہیں تو ان کے ملک وقوم کی یہ حالت ہے کہ غدر ۱۸۵۷ء کو فرو ہوئے چند سال گذر چکے ہیں، ہندوستان بیرونی مداخلت وتسلط کے شکنجہ میں پورے طور پر کسا ہوا ہے۔ مسلمانوں کی قوم خصوصیت کے ساتھ اپنی شامت اعمال کے نتائج بھگت رہی ہے۔ اسلامی اخلاق، اسلامی آداب، اسلامی معاشرت مدت ہوئی رخصت ہو چکے ہیں۔ تعلیم وتربیت، اتفاق واتحاد، نظم وانتظام، ضبط وخوداری، ہمت وبلندنظری، صداقت وحق پرستی، قناعت اور ایثار میں سے کوئی ایک شے موجود نہیں ہے۔ عقائد میں تنزل آچکا ہے، تعلیم کے لیے انگریزی مدرسے ہیں۔ سفر کے لیے انگریزی سواریاں ہیں، علاج کے لیے انگریزی شفاخانے ہیں، رسل ورسائل کے لیے انگریزی ڈاک خانے ہیں، مہاجنی کے لیے انگریزی کوٹھیاں ہیں اور بنک ہیں ماضی سے واقفیت کے لیے انگریزوں کی کتابیں ہیں، حال سے باخبر رہنے

---

[1] اردو بابت ماہ اپریل ۱۹۲۳ء مضمون عبدالماجد دریا آبادی

کے لیے انگریزوں کے اخبارات ہیں، مستقبل کی پیشن گوئی کے لیے انگریزی سائنس ہے، عزت و حکومت کے لیے انگریزی عہدے ہیں، حصول زر کے لیے انگریزی و بیرسٹری، وکالت، ڈاکٹری ہیں غرض جس طرف بھی رخ پھرتا حدنظر تک ایک غیر محدود و نامتناہی پرچم انگریزی اقبال کا لہراتا ہوا نظر آتا ہے۔ سوتے ہوئے شخص کے کمرے میں دفعتاً تیز روشنی کردی جائے تو وہ سمجھے گا کہ آفتاب نکل آیا۔ یہی حال اس وقت قوم کا تھا۔ اضطرار قلب، انتشار خاطر، اختلال حواس و اجتماع حوادث کا حسن و جمال معلوم ہوا۔

اب مغرب کا جادو ساری قوم پر چل گیا، علم و فضل کا معیار کمال یہ قرار پایا کہ انگریزی زبان آجائے، تلفظ انگریزوں کا سا ہوجائے اور انگریزی علوم سے واقفیت ہوجائے، تہذیب و شائستگی کی معراج یہ ٹھہری کہ کھانا انگریزی کھایا جائے، لباس پہنا جائے اور انگریزی تقلید میں مشترکہ خاندان کے وجود کو ذلیل سمجھ کر ضعیف والدین اور دوسرے اعزا سے قطع تعلق کرلیا جائے۔ شرافت و عزت کا منتہائے خیال یہ قائم ہوا کہ ہر ممکن ذریعہ سے انگریزی عہدے حاصل کیے جائیں۔ انگریزی حکومت کی برکات کا وعظ کہا جائے اور اپنے ہم وطنوں اور ہم قوموں کو نقصان پہنچا کر انگریزی دربار میں رسوخ حاصل کیا جائے۔ عقل و دانش کا یہ مفہوم قرار پایا کہ ہر انگریزی مصنف کے ہر قول پر بے چوں و چرا ایمان لے آیا جائے اور اپنے علوم و فنون، اپنے شعائر و رسوم، اپنے عقائد و خیالات کو یکسر اوہام کا لقب دے کر انگریزیت کے صنم دلربا کے قدموں پر نثار کردیا جائے۔''[1]

بہر حال یہ فضا تھی جس میں اکبر نے اپنی آنکھیں کھولیں یہ ماحول تھا جس میں انھیں اپنا پیام پہنچانا تھا۔ ان کا پیام اسی تحریک مغربیت کے خلاف ردعمل تھا ان کی شاعری اول سے آخر اسی مادیت اور مغربیت

---

[1] اردو بابت ماہ اپریل ۱۹۲۳ء، مضمون: عبدالماجد دریا آبادی

پرستی کا جواب ہے۔

اکبر نے زندگی کے ہر شعبہ پر اپنے مخصوص رنگ میں اظہار خیال کیا ہے۔ ان کے یہاں بعض بعض الفاظ کے مخصوص معنی اور مفہوم ہیں جن کو وہ اس لطیف انداز سے اپنے کلام میں لاتے ہیں کہ ان کا پورا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ حالاں کہ ان کی تشریح کی جائے تو ورق کے ورق سیاہ ہو جائیں اور پھر بھی کافی طور پر دل نشین نہ ہو سکیں مثلاً: نیٹو، بابو، مولوی، اونٹ، بدھو، صاحب، شیخ صاحب، گزٹ، ڈارون، کالج، ڈنر، کونسل، کیمپ، پریڈ اور کمیشن وغیرہ۔

اس سلسلے میں مناسب ہوگا اگر یہاں اکبر کے مسلک کا ضمناً تذکرہ کر دیا جائے۔ اکبر مشرقیت کے دلدادہ اور مغرب سے سخت متنفر اور بیزار ہیں وہ باطن کو ظاہر پر فوقیت دیتے ہیں، وہ مغرب کی مادیت کو مذہب اور اخلاق کا دشمن سمجھتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے نہ صرف مغربی تہذیب و تمدن کے خلاف آواز بلند کی بلکہ ہر اس چیز کی مذمت کی جس کا مغرب سے ذرا سا بھی تعلق ہو۔ وہ شوہر پرست بیوی کو پبلک پسند لیڈی (Lady) پر ترجیح دیتے ہیں غرض کہ وہ ان تمام باتوں کے خلاف جنگ آزما تھے جن کا تعلق بدمذاقی، کورانہ تقلید، بے تمیزی اور تنگ نظری سے تھا۔

اکبر کا مقصد اگر چہ اپنی شاعری کے ذریعہ معاشرے کی اصلاح کرنا تھا اور مغرب زدہ لوگوں کو اپنے مشرقی طور طریقوں سے روشناس کرانا تھا لیکن ان کی شاعری مقصدیت کا شکار نہ ہو کر رہ گئی۔ ان کی شاعری میں طنز کوٹ کوٹ کر بھرا ہے لیکن یہ طنز زہرناک نہیں کہ بدمزگی کا سبب بن جائیں بلکہ اس طنز میں مزاح ہی مزاح کارفرما نظر آتا ہے۔

اب یہاں بعض عنوانات کے تحت لسان العصر کے کلام کا جستہ جستہ نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔

پہنتے ہیں جب سوٹ اکڑ بیٹھتے ہیں
مصیبت میں خود کو جکڑ بیٹھتے ہیں

یہاں سوٹ بوٹ مغرب زدوں پر طنز کیا گیا ہے لیکن شعر کچھ اس طرح تصویر سامنے لاتا ہے کہ مسکراتے ہی بنتی ہے۔ طنز اپنی جگہ پر پوری شدت اور طاقت کے ساتھ موجود ہے لیکن مزاح کے پہلو سے شعر بالکل خالی بھی نہیں ہے۔

شوخی اور ظرافت اکبر کا طبعی رنگ تھا جس کی وجہ سے ان کی نظم بھی اسی رنگ میں رنگ گئی اور ان کی شاعری سراپا مزاح بن گئی۔

کیا پوچھتے ہو اکبر شوریدسر کا حال
خفیہ پولیس سے پوچھ رہا ہے کمر کا حال
ہاون تو ہے ہوس کا دستہ ہے پالیسی کا
لیکن ادھر تصور جاتا نہیں کسی کا
ہے کوفت لیکن اس پر مسرور ہورہے ہیں
ہر سو اچھل رہے ہیں او چور ہورہے ہیں
فطری خوبی ہے مبتلا نالج میں
بلبل داخل ہے میوزیکل کالج میں
داخل میں نوائے ساز کی کس کو خبر
رعشہ ہر سو کو ہے مگر خارج میں[1]

.....

حکم برٹش کا ملک ہنود کا
اب خدا ہی بھائی صلّو کا

.....

---

[1] کلیات اکبر الہ آبادی، ص: ۸۰

شیخ جی کے دونوں بیٹے باہنر پیدا ہوئے
ایک ہیں خفیہ پولیس میں ایک پھانسی پاگئے

.....

اکبر سے میں نے پوچھا اے واعظ طریقت
دنیائے دوں سے رکھوں میں کس قدر تعلق
اس نے دیا بلاغت سے یہ جواب مجھ کو
انگریز کو ہے نیٹو سے جس قدر تعلق

.....

اکبر مشرقی اقدار کے شیدائی ہیں اور مغربی طرز وتہذیب کو وہ انتہائی نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے کچھ معاصروں نے اور بعد کے لوگوں نے بھی انھیں ترقی کی راہ میں روڑا سمجھا اور کہا کہ اکبر نئی تہذیب، نئی قدروں اور انسان کی ترقی اور نئی روشنی سے خوف زدہ ہیں لیکن اکبر جانتے تھے کہ نئی تہذیب کی یہ نئی قدریں جو برخود غلط لوگوں کے بیکار ذہنوں کی پیداوار ہیں اور انھی کے ہاتھوں پلیں، بڑھیں اور فروغ پا رہی ہیں اور نئی ترقی اور نئی روشنی جو اندھیرے کی ضد نہیں بلکہ اندھیرے کی پیدا کردہ ظلمت ہی ہیں انسان کو اس کی صحیح منزل تک کبھی پہنچنے دیں گی یہ ساری قدریں یہ نئی روشنی یہ ترقی تو سراسر فریب ہے، دھوکہ ہیں اور انسان کی صحیح اقدار و اخلاق کے لیے سم قاتل ہیں۔ ایسا اقدار، ایسی ترقی اور ایسی روشنی پر کھڑا کیا جانے والا نظام تو استحصالی ہوگا جو چند آدمیوں کے مفاد کی خاطر لاکھوں انسانوں کو فنا کردے گا۔

جس روشنی میں لوٹ ہی آپ کو سوجھے
تہذیب کی میں اس کو تجلی نہ کہوں گا
لاکھوں کو مٹاکر جو ہزاروں کو ابھارے
اس کو تو میں دنیا کی ترقی نہ کہوں گا

اس نئی روشنی والے نظام کی تعلیم کے بارے میں فرماتے ہیں۔

تعلیم جو دی جاتی ہے ہمیں وہ کیا ہے فقط بازاری ہے
جو عقل سکھائی جاتی ہے وہ کیا ہے فقط سرکاری ہے

شیخ وزاہد کی بھی خوب خبر لی ہے جو ہر دور میں فتنہ وفساد کے باعث بنے ہیں۔

کچھ شک نہیں کہ حضرت واعظ ہیں خوب شخص
یہ اور بات ہے کہ ذرا بے وقوف ہیں

.....

شیخ اپنی رگ کو کیا کریں ریشے کو کیا کریں
مذہب کے جھگڑے چھوڑیں تو پیشہ کیا کریں

دین ودنیا کے متعلق۔

خدا کے فضل سے بیوی میاں دونوں مہذب ہیں
حجاب ان کو نہیں آتا انھیں غصہ نہیں آتا

.....

تعلیم کی خرابی سی ہوگئی بالآخر
شوہر پرست بیوی پبلک پسند لیڈی

.....

اٹھ گئے وہ جنھیں مقدور تھا خودداری کا
نہ وہ تقویٰ نہ وہ تعلیم نہ دل کی امید
ولولے لے کے نکلنے لگے کالج کے جواں
شرم مشرق کے عدو، شیوۂ مغرب کے شہید

دو اسے شوہر اطفال کی خاطر تعلیم
قوم کے واسطے تعلیم نہ دو عورت کو
تہذیب نو جسے تم کہتے ہو اس سے اکبر
دنیا بگڑ رہی ہے اب یا سنور رہی ہے
نقشوں کو تم نہ جانچو خلقت سے مل کے دیکھو
کیا ہورہا ہے آخر کیسی گزر رہی ہے
دل میں خوشی بہت ہے یا رنج اور تردد
کیا چیز جی رہی ہے کیا چیز مر رہی ہے

اکبر نے نثر میں بھی طنز وظرافت کے پھول کھلائے ہیں وہ اودھ پنچ کے صفحات میں ا.ح.الہ آبادی کے نام سے مضامین لکھتے تھے۔''کوئی کہتا ہے دیوانہ کوئی کہتا ہے سودائی'' اور''ایک نادان خوش اعتقاد کی دعا'' ان کے اچھے مضامین ہیں۔نظم کی طرح نثر میں اکبر کوئی نئی شاہراہ نہیں نکال سکے ان کا طرز تحریر معمولی ہے ہاں کہیں کہیں نثر میں انھوں نے شاعری کرنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ ان سے نبھ نہ سکی تاہم ان کے مضامین میں لطف زبان اور ظرافت کا چٹخارہ ضرور موجود ہے۔

اودھ پنچ کے تیسرے اہم قلم کار پنڈت رتن ناتھ سرشار تھے۔ وہ شروع میں اودھ پنچ سے منسلک رہے پھر ۱۸۷۸ء میں منشی نول کشور پریس نے انھیں اودھ اخبار کی ادارت سپرد کی اور اسی اخبار سے ظرافت کا وہ عدیم المثال شاہکار منصۂ شہود پر آیا جو فسانہ آزاد کے نام سے مشہور ہوا،لیکن انھیں''اودھ اخبار'' کی ایڈیٹری مل جانے کے سبب اس حلقہ سے جدا ہونا پڑا اور حالات نے ان کو اودھ پنچ کا حریف بنادیا تاہم کچھ عرصہ تک اودھ پنچ سے وابستہ رہنے کے سبب ان کا نام بھی اودھ پنچ گروہ میں شمار کیا جاتا ہے۔

سرشار اپنے عہد کی ظرافت کے بہترین نمائندے تھے انھوں نے نوابی لکھنؤ اور اس کی سوسائٹی کی

تصویریں اپنے قلم سے ظریفانہ انداز میں ہو بہو کھینچ کر ادب میں بلند مقام حاصل کرلیا ہے۔ اگر چہ سرشار سے قبل اور سرشار کے بعد بھی اکثر ادیبوں نے نوابی لکھنؤ کے مرقعے کھینچے ہیں لیکن سچ تو یہ ہے کہ وہ سرشار کو نہ پہنچ سکے۔ سرشار کی تصویروں میں لکھنؤ ہر انداز اور ہر پہلو سے جلوہ گر ہے جس میں ہمیں ہر رنگ اور ہر قسم کی تصویریں ملتی ہیں۔ نواب و روساء کی عیش پروری، نازک مزاجی، حماقت مآبی، مصاحبین کی شوخی، چالاکی و عیاری، بیگمات کی سادگی و پرکاری، مغلانیوں اور پیش خدمتوں کی حاضر جوابی و بذلہ سنجی، پیروں اور بزرگوں کی مکاریِ و چالبازی، علماء وفضلاء کی لن ترانی، شرابی، افیمی، چانڈو باز، بٹیر باز، پتنگ باز، کبوتر با، چور، اچکے، ڈاکو، لٹیرے اور بدکرداروں کی عادتیں اور خصلتیں بہادر، سپاہی، شہ زور پہلوان، اور منچلے بانکوں کے کارنامے، محرم، چہلم، عید، بقرعید، ہولی، بسنت، عرس، میلے، ٹھیلے، شادی بیاہ، شریف زادوں اور طوائفوں کے ناز وانداز، راز ونیاز، میل و جھگڑے، غرض لکھنؤ کے آخری تمدن اور سوسائٹی کی مکمل تصویریں سرشار نے پوری جزئیات کے ساتھ پیش کی ہیں۔

سرشار میں طنز وظرافت کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود تھی اور زندہ دلی ان کی فطرت تھی۔ وہ خود ہنسنے اور دوسروں کو ہنسانے کے لیے پیدا ہوئے تھے وہ لکھنؤ کی زوال پذیر معاشرت کا تذکرہ بھی ایسے الفاظ میں کرتے ہیں کہ بے اختیار ہنسی آجاتی ہے۔ حالانکہ اس کی تہہ میں طنز کے نشتر چھپے ہوتے ہیں لیکن سرشار طنز کے میدان میں زیادہ کامیاب نہیں ان کے یہاں طنز کم ہے اور ظرافت زیادہ ہے۔

سرشار نے فسانہ آزاد، سیر کہسار، جام سرشار، کڑم دھم، کامنی، ہشو، پی کہاں، طوفان، بے تمیزی اور رنگے سیار کتابیں لکھیں لیکن فسانہ آزاد کی سی بات کسی میں نہ پیدا نہ ہوسکی۔ شاید انھوں نے اپنی ساری طباعی اور تخلیقی صلاحیت فسانہ آزاد پر صرف کردی تھی۔ اپنی دوسری تصنیف میں نہ تو واقعات میں کوئی تنوع پیدا کرسکے اور نہ ظرافت کا اعلیٰ نمونہ پیش کرسکے البتہ زبان کی چاشنی روزمرہ اور ضلع جگت کے اعتبار سے ان کی تمام تصنیفات ایک خاص لطف کی حامل ہیں۔ اس اعتبار سے بھی جو مرتبہ فسانہ آزاد کو حاصل ہوا وہ ان کی دیگر

تصنیفات کو نہ مل سکا یہ افسانہ اودھ اخبار میں ۱۸۷۹ء تک برابر شائع ہوتا رہا۔ ۱۸۸۰ء میں تقریباً ساڑھے تین ہزار صفحات پر مشتمل کتابی شکل میں شائع ہوا ایسی دیوزادہ تصنیف اردو کے کسی اور صاحب قلم کو نہ نصیب ہوسکی۔ رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں:

''سرشار کی سب سے بہتر اور ان کے کمالات کی بہترین نمائندہ تصنیف فسانہ آزاد ہے۔''[1]

یہ صرف تبصرہ نہیں حقیقت کا اعتراف ہے۔ مگر فسانہ آزاد صرف فسانہ نہیں ایک لٹی ہوئی تہذیب، ایک اجڑی ہوئی معاشرت اور ایک زنگ آلود تمدن کا دلدوز نقشہ ہے۔ اس افسانہ میں وہ سب موجود ہے جو سرشار نے اپنی آنکھوں سے دیکھا جو سنا اور جسے ان کے دل و دماغ نے محسوس کیا۔ لہٰذا پورا لکھنؤ اس افسانہ میں متحرک نظر آتا ہے۔ سرشار کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے کردار و واقعات اپنی دنیا سے لیے ان میں رنگ بھرا اور زندگی کے فریم میں جو تصویر جہاں موزوں معلوم ہوئی اسے وہیں جڑ دیا۔ یہی سرشار کی سب سے بڑی حقیقت نگاری ہے اور یہ حقیقت نگاری ان کے اسلوب بیان اور طرز نگارش کی رہین منت ہے۔ انھیں زبان پر عبور ہے، روزہ مرہ اور بیگماتی زبان پر دسترس ہے ان کی تحریر میں قدم قدم پر حاضر جوابی، بذلہ سنجی، فقرے بازی، پھبتی، ضلع جگت اور اشعار کا استعمال بے تحاشہ ملتا ہے۔ فارسی اور اردو کا مضحکہ خیز امتزاج، تلفظ اور الفاظ کے الٹ پھیر سے ظرافت کے نئے نئے پہلو سامنے آتے ہیں۔ سرشار نے ظرافت کے ان تمام حربوں سے کام لیا ہے جن سے ظرافت کو تحریک ملتی ہے۔ یہ طرز نگارش ہی کا سحر ہے کہ فسانہ آزاد بے انتہا طوالت کے باوجود طبیعت پر بار نہیں ہوتا تکرار کے باوجود شگفتگی اپنی جگہ قائم رہتی ہے۔ بلاشبہ یہ اسلوب بیان اور انداز تحریر کا ہی معجزہ ہے کہ ان کی نثر یکسانیت اور اکتاہٹ پیدا نہیں ہونے دیتی، طرز نگارش کے متعلق آل احمد سرور کی رائے:

---

[1] رشید احمد صدیقی، طنزیات و مضحکات، ص:۵۶

''ان کا طرز نثر اردو کے ارتقا کے لحاظ سے نذیر احمد سے زیادہ قدیم ہے۔ یہ فسانہ عجائب کی ترقی یافتہ صورت ہے۔''[۱]

فسانہ آزاد میں ہزاروں خوبیوں کے علاوہ اکثر خامیاں بھی ہیں جن پر ان کے معترضین نے جی کھول کر خامہ فرسائی کی ہے۔ مزید برآں اتنی ضخیم تصنیف میں جہاں قدم قدم پر لغزش ہونے کا امکان ہے سرشار نے بہت حد تک ان سے دامن بچایا ہے پھر بھی جو خامیاں ان سے سرزد ہوگئی ہیں ان کی بنا پر اردو ادب میں سرشار کا رتبہ کم نہیں کیا جاسکتا۔

اودھ پنچ کے چوتھے اہل قلم کا رمچھو بیگ ستم ظریف تھے ستم ظریف نثر و نظم دونوں میں لکھتے تھے۔ نثر کے نامہ نگاروں میں طبیعت کے چلبلے پن اور شوخی کے لحاظ سے نیز زبان کی پختگی اور لکھنؤ کی بول چال اور محاورہ کی صفائی کے اعتبار سے ستم ظریف کا رنگ اوروں کے مقابلے میں چوکھا ہے۔[۲]

ستم ظریف شرفائے لکھنؤ میں ایک ممتاز درجہ رکھتے تھے ان کا اصلی نام مرزا احمد مرتضی تھا مگر اودھ پنچ میں برسوں تک مرزا مچھو بیگ ستم ظریف کے فرضی نام سے مضامین لکھتے رہے۔ ستم ظریف اسم با مسمی تھے، مزاج میں ظرافت اور بذلہ سنجی کو اس قدر دخل تھا کہ ہر بات میں ظرافت کا کوئی نہ کوئی پہلو ڈھونڈ لیتے اور اپنے مخاطب کو ہنساتے ہنساتے لٹا دیتے۔ قدرت نے شاعرانہ دل و دماغ عطا فرمایا تھا لیکن پیشہ آبا ''سپہ گری'' ہونے کے سبب بائیس سال کی عمر تک اتنی مہلت نہیں مل سکی جو اس صلاحیت کو بروکار لاتے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد اس غیر شاعرانہ کام سے نجات پا کر شعر و سخن کی جانب متوجہ ہوئے۔ اسی زمانے میں مرزا نسیم لکھنؤ تشریف لائے ان کی صحبت اور شاگردی نے فطری جوہر کو چمکا دیا اور رفتہ رفتہ ستم ظریف کا اپنے عہد کے اساتذہ میں شمار ہونے لگا لیکن یہ قدرت کی ستم ظریفی تھی کہ ستم ظریف کو نظم سے زیادہ نثر میں شہرت

---

۱ آل احمد سرور، تنقیدی مضامین، ص: ۴۰

۲ گلدستہ پنچ از دیباچہ چکبست، ص: ۶

حاصل ہوئی ان کے وہ مضامین جو اودھ پنچ میں شائع ہوئے ہیں۔ آج بھی سلاست زبان صحت محاورہ اور ظرافت کے لیے مشہور ہیں، ستم ظریف نے سماجی و گھریلو زندگی کی نہایت معمولی معمولی باتوں کو مشق ستم بنایا ہے وہ طنز سے زیادہ ظرافت سے کام لیتے ہیں اور محاورات کے استعمال سے بخوبی واقف ہیں ہر سطر میں پر لطف محاورے کا استعمال ان کی عبارت میں خاص لطف پیدا کر دیتا ہے۔ پیش ہے ان کی ظرافت کا ایک نمونہ:

ہوگیا زندگی سے جی بے زار

وقنا ربنا عذاب النار

توبہ سوتوبہ تلا دوہائی، تہائی، چوتھائی، داد بے داد فریاد والغیاث وغیرہ وغیرہ بایں ہمہ کان پکڑ کے اٹھا بیٹھی بعد ملاحظہ نظر ثانی پھر توبہ کر بندے اس گندے روزگار سے۔ کیا کہیے اور کیا نہ کہیے آج تک مع مبالغہ پونے پانچ کروڑ برس ہوئے کہ اس عذاب النار کا مطلب سمجھ کے بیچا بیچ میں نہیں آتا۔ بعض عذاب النار کے یہی معنی بھاڑ چولہے کی آگ کو کہتے ہیں۔ بہترے ملا قل اعوذ نار دوزخ جو ہمارے معزز مولانائے مغربی کے بقول یونہیں سا ایک دوہڑ پنکا ڈراوے دھمکاوے کا آلہ ہے ماں بیٹے میں اکثر پیٹو مر بھکے پیٹ کی آگ یعنی بھوک پیاس کا عذاب سمجھے ہوئے ہیں۔ بعضے سپاہی پیشہ لڑنے مرنے مورچہ میدان داری کے آدمی بندوق کی نلی سے تعبیر کرتے ہیں۔ غرض یہ کہ اپنے اپنے خیالی پلاؤ کون ایسا ہے کہ نہیں پکاتا۔ خاص مطلب سچی بات وہی ہے جو ایک برگزیدہ، سن رسیدہ، گرم وسرد چشیدہ پہنے ہوئے اللہ والے بزرگ نے مرتے وقت چپکے سے کہی تھی کہ بھیا، نار سے مراد عورت یہی عذاب وہ ہے کہ جس سے پناہ مانگنی چاہیے بلکہ پناہ بھی مانگے نہیں ملتی۔[1]

طنز و مزاح کی مثال میں دو اقتباس درج ذیل ہیں:

''اے لو صاحب میاں ۱۸۷۷ء بھی سوتے جمعہ نفروا الی اللہ ہوئے۔ سال بھر

---

[1] اودھ پنچ، مارچ ۱۸۹۶ء

خوب کوڑے کیے، رقمیں گانٹھیں، گلے کاٹے، بارہ مہینے کے اندر لاکھوں شعبدے، سینکڑوں کرشمے دکھلائے، گاؤں کے گاؤں صاف کر دیئے، شہر کے شہر تباہ کر دیئے۔ کبھی بوند بوند بھر پانی کو ترسایا..... کبھی دلی کو رونق دی، کبھی آگرہ کو، روم و روس میں جدا چلوادی، سرحد پر الگ ہش فش کرادی اور پھر نیک نام کے نیک نام بلکہ سب سے کھرے رہے۔''[1]

''ہم سے نگوڑی کبوتری اچھی جب دیکھا کبوتر اس کے گرد پھرتا ہے چونچ سے کھنچتا جاتا ہے جوبن دیکھتا ہے، اور تو اور اپنے پیٹ کا دانہ اس کے منھ میں اگل آپ بیچارہ بھوکا رہتا ہے۔ پھر یہ ایک پیار اخلاص ہی نہیں، بچے پالے، تنکے چونچ میں اٹھا لائے، ڈربے میں گھر بنائے، انڈے سیا کرے، کبوتری ذرا باہر نکلی اور غوں غوں یہ اپنی زبان میں بلاتا ہے، زبان تو ہے نہیں کہ کہے مطلب یہ کہ تو کیوں تکلیف کرتی ہے۔ یہیں چین سے بیٹھی رہو اور مزا یہ کہ وہ قطامہ ادھر کا رخ نہیں کرتی، بھاگتی ہے، دس دفعہ کی خوشامد درآمد میں ایک دفعہ شاید یہ بھی چونچ سے چونچ سے ملا دیتی ہوگی اور بڑی بڑائی ادھر کی ادھر اتراتی اتراتی قدم لٹکائے تیرتے پھرتی ہیں۔

ابھی کل کی بات ہے کہ دو تین مرتبہ میں نے خود کہا کہ کیوں صاحب تم نے تو اب سب کہیں کا آنا جانا اٹھنا بیٹھنا چھوڑ ہی دیا، رات دن گھر میں کھونٹے سے لگے رہتے ہو، گھڑی بھر کو ٹانگیں سیدھی کر لیا کرو اسی وجہ سے کھانا ہضم نہیں ہوتا، ٹل ٹلی چلا کرتی ہے تو حضور فرماتے تھے کہ صاحب سنو باہر تم جانہیں سکتیں اب تمھارے دیکھے بغیر چین کیوں کر آئے میں کہتا ہوں گھڑی بھر میں تو میرا دل الٹ جائے۔

چلئے صاحب وہی ہم ہیں کہ پڑے مکھیاں مار رہے ہیں پورے نو بجے میاں

---

[1] اودھ پنچ، مارچ ۱۸۹۶ء

سدھارے تھے یقین ہے کہ بارہ بجے کو آئے ہوں گے اس بندہ خدا نے پھر کروٹ بھی نہیں لی۔

ہوگیا زندگی سے جی بے زار
وقنا ربنا عذاب النار[1]

نثر سے زیادہ نظم میں طنز کا خوب استعمال کیا ہے۔

دھوم سے آیا نیا سال مبارک باشد
خوش ہیں سب ہند کے کنگال مبارک باشد
رہ گئے ڈھانچ فقط سوکھ کے ایجور ہوئے
ہڈیوں پر ہے فقط کھال مبارک باشد[2]

.....

آئی ہے دھوم دھام سے اب کی مگر بسنت
یرقان کے مرض میں ہوئی جلوہ گر بسنت
فاقوں کے مارے چھائی ہے چہروں پر مردنی
کہنے کو زرد رُو ہیں مہنسائی مگر بسنت[3]

عامیانہ طنز وظرافت کی شعوری کوشش ستم ظریف کی تحریروں کو بلند درجہ عطا نہیں کرتی۔ زبان کے چٹخارے میں الجھ کر وہ اپنے نشانہ ستم کو بھول جاتے ہیں نتیجے میں ظرافت منھ موڑ لیتی ہے اور زباندانی اپنا جوہر دکھانے لگتی ہے۔

---

۱ اودھ پنچ، فروری ۱۸۹۲ء
۲ اودھ پنچ، فروری ۱۸۸۶ء
۳ اودھ پنچ، فروری ۱۸۸۶ء

پنڈت تربھون ناتھ ہجر اودھ پنچ اخبار کے پہلے ''قدرداں اور خریدار تھے'' بچپن ہی سے شاعری اور انشا پردازی کا شوق تھا چنانچہ شاعری میں قدر بلگرامی کے شاگرد تھے اور اردو فارسی میں شعر کہتے تھے۔ نثر میں زیادہ تر سنجیدہ و معلوماتی مضامین لکھتے تھے جنھیں عوام و خواص پسند کرتے تھے لیکن ہجر کی شہرت ان کی سنجیدہ شاعری و سنجیدہ نثر نگاری کی وجہ سے اتنی نہیں ہوئی جتنی اودھ پنچ سے وابستہ ہوجانے پر مزاحیہ نثر نگاری کے سبب ہوئی۔

ہجر قدرتی طور پر سنجیدہ و متین طبیعت کے مالک تھے لیکن بلا کے ذہین اور بذلہ سنج واقع ہوئے تھے۔ ہر رنگ میں ان کی ذہانت و بذلہ سنجی اپنا خاص رنگ دکھا جاتی نثر میں انھوں نے فسانہ آزاد کا رنگ اختیار کیا اور عوام و خواص کی بے اعتدالیوں اور خامیوں کو خصوصیت سے نشانہ تمسخر بنایا۔ لہٰذا افیون، بھنگ اور چانڈو کی مذمت میں متعدد مضامین ظرافت کے پیرایہ میں لکھے لیکن اس کے پردے میں طنز کا نشتر ہمیشہ موجود رہا یہ اور بات ہے کہ اس میں مخصوص اودھ پنچی نشتریت نہیں ہوتی۔ وہ آہستہ آہستہ نشتر کے کچوکے لگاتے ہیں، ایک دم چھیڑ چھاڑ کے قائل نہیں ان کی ظرافت بھی دوسروں کے مقابلہ میں صاف اور ستھری ہے وہ حتی الامکان اپنی تحریر کو پھکڑ پن عریانیت اور فحاشی سے پاک و صاف رکھتے ہیں ان کی تحریریں دوسروں کو قہقہہ لگانے پر مجبور کردیتی ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ پنڈت تربھون ناتھ ہجر کی طنز و ظرافت کا موضوع کوئی نیا نہیں۔ رتن ناتھ سرشار و دیگر ہمعصروں نے بھی اس پر کامیاب خامہ فرسائی کی ہے۔ لیکن اس پامال موضوع کو بھی انھوں نے اس خوبصورتی سے نبھایا ہے گویا اپنالیا ہے۔ ''نشہ کی ترنگ'' اور ''دو دو چونچیں'' جیسے مضامین کے مطالعے کے بعد ان کی اس ذہانت اور طباعی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ اگر ہجر منظر نگاری و تصویر کشی میں سرشار کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکے تاہم ''محرم الحرام'' کے زیر عنوان کا جو مضمون اودھ پنچ میں شائع ہوا ہے وہ ایک کامیاب کوشش ہے۔

مضمون ''محرم الحرام'' سے ایک اقتباس:

''آخر آپ ہیں کون، کہاں سے آنا ہوا، الحمدللہ آپ خیر سے تو جاگے، مسافروں کا پتہ نشان کیا، اخ، آہ، آپ ہیں بسم اللہ، آیئے بغل گیر تو ہولیں، حقیقت یہ محرم میں سفر (صفر)، کیسا جی یہ زمانہ الٹوانسی ہے بڑے دن کی خوشی اور محرم کے ماتم کو نہ دیکھ لیجئے، ماشاء اللہ کیا اجتماع ضدین ہوا ہے۔ ہاں یہ تو فرمایئے کیوں کر آئے، نہ سان گمان کھٹ سے آموجود، ائے رخصت یہ نہ پوچھیے آئے تو اس طرح آئے، جس طرح سمندر میں جوار بھاٹا، زمین میں زلزلہ، ہندوستان میں ادبار، مدارس میں قحط، سلطنت عثمانیہ میں زوال، کابل میں روسیوں کی سفارت، دیسی اخباروں میں ایکٹ نو، چشم بددور آپ کی آمد، آمد نہ ہوئی قیامت ہوئی، بھئی لکھنؤ کا بھی محرم بھی یاد رہے، ہم خرما و ہم ثواب، دنیا اور عقبیٰ دونوں کے فائدے، زیادتیوں میں قند مکرر کی حلاوت، روحانی و جسمانی دونوں لذتیں۔''[1]

## نشہ کی ترنگ میں سرشار کا رنگ

مہنگا کر آٹا اور سستی کر افیم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

''اے جناب اودھ پنچ صاحب واللہ ہے کل مکتب میں کیا جی خوش ہوا ہے کہ قسم ہے جناب امیر علیہ السلام کی۔ یہی بار بار دل چاہتا تھا کہ اللہ رکھے منے مرزا کو ایک دم چھاتی سے جدا نہ کروں، بخدا کسی نے سچ کہا تخم تاثیر صحبت اثر، پھر آخر اچھے مرزا ہی کے صاحبزادے ہیں۔ ماشاء اللہ سے وہ بلا کی طبیعت پائی ہے کہ حضت کیا عرض کروں مجھے تو

---

[1] اودھ پنچ، فروری ۱۸۹۱ء

رہ رہ کر یہ خیال آتا ہے کہ یہ دن سن، نام خدا، اٹھتی جوانی، ہنوز مسیں بھی اچھی طرح سے بھیگی نہیں ہیں اور یہ فکر آسمان پیما۔ خدا چشم زخم زمانہ سے بچائے، وہ پیاری طبیعت پائی ہے کہ سبحان اللہ باوجود صدہا نوکروں کے اچھے مرزا اپنے ہاتھ سے چلم بھر کر دیتے ہیں اور پھر میں اس چلم کی کیا تعریف کروں جس میں تلے اوپر چار توے اور مزا یہ کہ چاروں کی کیفیت نرالی، ایک چلا دوسرا موجود، ہر کش شربت کا گھونٹ، ہائے لال لال سچے کولوں کو اس ترتیب سے سجاتے ہیں کہ تحریر اقلیدس کی جس شکل سے چاہیے بھڑا لیجئے۔ اگر سر موفرق ہو تو ہاتھ قلم کر ڈالیے۔ ایک حقہ ہی نہیں، چانڈو کا قوام وہ پریا تیار کرتے ہیں کہ بس اور کیا کہوں کہ ہاتھ چوم لے، اور بھئی ان کی سی محنت کوئی کر تو لے، جناب سید الشہداء کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ افیم بانات کے ٹکڑے میں کم از کم دو سو مرتبہ تو معطر کرتے ہیں اس وقت اس کی رنگت دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔''[1]

اردو فارسی میں اگر چہ ہجر نے غزلیں کہی ہیں لیکن وہ غزل گو نہیں، انھیں مسدس کے رنگ سے خاص انسیت تھی، ابتدا میں وہ سنجیدہ کلام کہتے تھے لیکن بعد میں اودھ پنچ کی وابستگی سے ان کی نظموں میں طنز و ظرافت کا نمایاں رنگ جھلکنے لگا تھا ''لسان الغیب'' ''فغان کشمیر'' ''نوحہ کشمیر'' اور ''کچا چٹھا'' ان کی کامیاب نظمیں ہیں۔ لیکن شاعری میں ان کی شہرت ان نظموں کے علاوہ ان تحریفوں کے سبب بھی ہے جو مغربی پیروڈی کی طرز پر لکھی گئی ہیں۔ سرشار اور اکبر کے ساتھ ہجر کا نام بھی ان تحریف نگاروں میں آتا ہے جنھوں نے سب سے پہلے مغربی طرز پر تحریف کی بنیاد رکھی۔ ہجر نے شیخ سعدی کی تصنیف کریما کے چند اشعار پر جو پیروڈی لکھی ہے وہ اولین تحریفوں میں ایک نمایاں مقام رکھتی ہے۔

ہجر کا شوق مطالعہ جنون کی حد تک پہنچا ہوا تھا اور یہ اسی کا طفیل تھا کہ اردو، ہندی اور فارسی کے علاوہ

---

[1] اودھ پنچ، اپریل ۱۸۹۱ء

انگریزی، کشمیری، پوربی، پنجابی، بنگالی زبانوں میں انھیں اچھی خاصی دستگاہ حاصل تھی۔ یہاں تک کہ پوربی اور پنجابی زبانوں میں ان کے ساقی نامے اور مثنویاں تک موجود ہیں۔ اکثر انگریزی زبان سے لطائف و ظرائف کا ترجمہ کر کے اودھ پنچ کے لیے بھیجا کرتے تھے۔ لیکن کیا مجال جو لطیفے کی سلاست اور روانی میں سرمو فرق آجائے، روح وہی رہتی تھی، قالب ضرور بدل جاتا تھا۔ یہی ان کے زباندان ہونے کا بین ثبوت تھا۔ ہجر اگر عین جوابی میں راہی ملک عدم نہ ہوتے تو پتہ نہیں اودھ پنچ کے صفحات میں کتنے اور نگینے جڑ جاتے۔

نواب سید محمد آزاد کا شمار اودھ پنچ کے نامور نثر نگاروں میں ہوتا ہے۔ سجاد حسین اور سرشار کی طرح آزاد اپنا مخصوص طرز تحریر رکھتے ہیں جس کا نمایاں وصف سنجیدگی ہے، ٹھہراؤ ہے، بات کرنے کا سلیقہ ہے وہ اپنے عہد کے پہلے شخص ہیں جنھیں بجا طور پر طنز نگار کہا جاسکتا ہے ان کے متعلق رشید احمد صدیقی کی رائے ہے کہ:

> ''مغرب اور مغربیت کے خلاف نواب آزاد نے جس معقول اور دلنشین پیرائے میں طنز کیا ہے اس کا جواب بحیثیت مجموعی اردو ادب میں ملنا دشوار ہے۔ آزاد کی طنز و ظرافت میں جو چیز نہایت نمایاں اور با مزہ ہے وہ ان کی خلقی شگفتگی ہے، کینہ پروری اور زہرناکی کا عنصر کہیں نمایاں نہیں ہے۔ اس اعتبار سے ان کو اردو ادب کا ''ہورلیس'' اور ''چاسر'' کہا جاسکتا ہے۔ آزاد نے ہندوستان کے سیاسی اور معاشرتی رجحانات پر نہایت جامع طریق سے اظہار خیال کیا ہے۔ ان کی طنز و ظرافت اتنی صحیح اور جامع اور ادب و انشا کے صحیح معیار کی اس درجہ حامل ہے کہ ان کے بقائے دوام پر دو رائیں ہونا تقریباً ناممکن ہے۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ نواب آزاد کی تحریریں اکثر کافی حد تک عریاں ہیں اور کہیں کہیں تبسم زیر لبی کے بجائے دانتوں تلے انگلیاں بھی دبانی پڑتی ہیں۔''[1]

---

[1] رشید احمد صدیقی، طنزیات و مضحکات، ص:۹۴

آزاد کے متعلق رشید احمد صدیقی کی یہ رائے مدح سرائی نہیں بلکہ صداقت پر مبنی ہے۔

دانتوں تلے انگلیاں وہاں دبانی پڑتی ہیں جہاں اودھ کی کھوکھلی اور مائل بہ انحطاط معاشرت کی تصویریں اپنے تمام خط وخال کے ساتھ اجاگر کی گئیں ہیں اور اس وقت یہ سوچنا پڑتا ہے کہ وہ قوم جو تمام دنیا کی ہدایت کے لیے منتخب کی گئی تھی کیا یہ مذموم اور شرمناک کارنامے اسی سے متعلق ہیں۔ ایسی دلخراش حقیقت تبسم زیر لبی کی شان نہیں پیدا کرسکتی البتہ تہذیب و معاشرت کے حمام میں سبھوں کے ساتھ اپنے آپ کو بھی ننگا دیکھ کر شرم سے سر بھی جھکالینا پڑتا ہے۔

''نواب آزاد'' نے اپنے ہمعصروں کی طرح مغربی تہذیب کے ساتھ ساتھ اپنی تہذیب کو بھی اپنے مخصوص انداز میں ہدف طنز بنایا ہے۔ اس سلسلے میں ان کے وہ فرضی خطوط جو انھوں نے انگلینڈ سے بھیجے ہیں اور اودھ پنچ میں ''پرانی روشنی کا نامہ و پیام'' کے زیر عنوان سے شائع ہوئے ہیں نہایت دلچسپ اور لطیف طنز کا پہلو لیے ہوئے ہیں۔ ان کا مشہور ڈرامہ ''نوابی دربار'' جو اودھ پنچ میں قسط وار چھپتا رہا اور بعد میں کتابی صورت میں شائع ہوا طنز کا اعلیٰ نمونہ ہے جس میں انھوں نے ایک طرف کاہل مشرقی نوابوں کا خاکہ اڑایا ہے تو دوسری طرف مسٹر جیمس کو مغرب کا ایک نمائندہ بنا کر مزاح و تمسخر کا نشانہ بنایا ہے لیکن کسی بھی جگہ اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے۔ اگر چہ آزاد کو انگریزی میں انٹرنس فیل ہونے کی عزت بھی حاصل نہیں تھی تاہم انگریزی میں ان کی قابلیت مسلم تھی انھوں نے انگریزی علوم کا بطور خود مطالعہ کر کے کافی علمی لیاقت پیدا کرلی تھی نواب آزاد نے تعریفات کی ایک لغت بھی مرتب کی ہے جس سے اس زمانے کے بدلے ہوئے سماجی اور تہذیبی تصورات کا پتہ چلتا ہے اگر چہ آزاد کی یہ ''چودھویں صدی کی نئی ڈکشنری'' ڈاکٹر جاسن اور عبیدزاکانی کا تتبع ہے تاہم اردو ادب میں ایک اضافہ ہے دلچسپ اور ظریفانہ انداز کی ان تشریحات نے اپنے زمانے میں وہ شہرت حاصل کی کہ اس رنگ کے سامنے اس وقت کے کل رنگ پھیکے پڑ گئے۔

خمارستان کے تہذیب یافتہ مدکیوں کی تجارت کے جلسے کا سالانہ ڈنر کے عنوان سے اپنی ایک تحریر

میں افیون کی سرکاری کاشت پر کس خوبی سے طنز کیا ہے:

''اب ہمارے ملک میں بھی افیون کی کاشت سرکاری طور سے جاری ہوگئی ہے کیونکہ ہمارا ملک اس کا محتاج ہے اور اب وہ زمان مسرت نشان قریب ہے کہ ہم لوگوں کا کروڑوں روپیہ ہمارے ہی ملک میں رہے گا اور ہم لوگ مالوا اور بہار کے بارعظیم سے دائمی طور سے سبکدوش ہوجائیں گے۔''

افیونیوں کی مستی کا کیا خوب نقشہ کھینچا ہے:

''یہ اسی چیز (افیون) کی برکت ہے کہ ہمارے ملک کے لوگوں نے آج تک بجز اس کی یاقوتی رنگت کے خون کی رنگت کبھی خواب میں نہیں دیکھی ہے اور یہ اسی کی کرامت ہے کہ صدہا سال سے ہمارے کان بجز سامعہ نواز آواز بانبو کے توپ و بندوق کی وحشت انگیز اور ہیبتناک اور عاقبت سوز آواز سے آشنا نہیں۔ (چیرز)

یہ اسی پری کا جلوہ ہے جس کا تصور ۱۲ بجے دن تک ہم لوگوں کو آنکھ نہیں کھولنے دیتا ہے اور یہ اسی حور کا عشوہ ہے کہ جس نے ہم کو ساری دنیا کی شیطانی لذتوں، ہوسوں اور خواہشوں سے بے نیاز کردیا ہے، یہ رحم دلی کا مادہ ہماری قوم میں اسی کا خاص عطیہ ہے کہ ترکوں کے بہادرانہ طور سے لڑنے مرنے کا تذکرہ سن کر دو دو دن تک ہم لوگوں کے ہوش پراں رہتے ہیں اور یہ اسی کی بخشی ہوئی بہادری کی نعمت ہے کہ ہمارے وطن پٹانے کی آواز پر دست بقبضہ ہوجاتے ہیں۔''[1]

دراصل افیونیوں کو ہدف بنا کر سید محمد آزاد نے اپنے معاشرے کی پستی کی خبر لی ہے اور اس کا خوب مذاق اڑایا ہے:

---

[1] اودھ پنچ، ۱۹ر فروری، ۱۸۷۸ء

''ہم لوگوں کا خیالی جنگی جہاز ایسا ہے کہ جو ہمارے چین کے سمندر سے ایک منٹ میں بحر اسود کی موجوں پر برق کی طرح چمکنے لگتا ہے اور ہماری پینک کی گاڑی ایسی ہے کہ جو ایک لمحہ میں ہزاروں سمندروں اور لاکھوں پہاڑوں کو طے کرتی ہے۔''[1]

بحیثیت مجموعی نواب آزاد کے طنز و مزاح کے متعلق واقعی دو رائیں ممکن نہیں دو ایسے خطوط کے اقتباسات ملاحظہ ہوں جو لندن سے لکھے گئے ہیں ایک خط محبوبہ کے نام ہے دوسرا مائی ڈیر پاپا کے نام ہے۔

پہلا خط:

''مگر جب سے کہ اس طلسماتی شہر لندن میں میں نے قدم رکھا ہے روز بروز صدمہ مفارقت گھٹتا گیا اور درد و جدائی کی تکلیف کم ہوتی گئی۔ اب بہ خدا تمہاری محبت اسی قدر اسی طرح کی مجھے ہے جیسے کسی کو اپنی پالی ہوئی چڑیا یا کسی پیارے جانور کی محبت اور یاد ہوتی ہے اس کے یہ معنی نہیں کہ میں تم کو بھول گیا ہوں یا تمہاری محبت بالکل میرے دل سے مٹ گئی ہے بلکہ تمہاری حالت کا جب کہ میں اس ملک کی حور نژاد عورتوں سے مقابلہ کرتا ہوں تو تم بالکل ایک نیم وحشی چارپایہ بن کر میرے تصور کے سامنے آتی ہو اور میں نہایت پچھتاتا ہوں کہ کیوں میری پیدائش ہندوستان میں ہوئی کیوں نیم وحشی گوشت کے ایک ہلنے ڈولنے والی چیز کو میرا باپ بنایا گیا اور کیوں تم سی معصوم نیم وحشی آدمی کے دائمی و عیش و آرام و پرورش کا میں ضامن ٹھہرا۔ واقعی اس سے بدنصیب دنیا میں کوئی نہیں جو اس مردم سوز خط غیر مہذب ہندوستان میں پیدا ہوا۔ تمہارے نیم وحشی بھائی کے خط کے ذریعہ سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ اکثر تمہاری طبیعت بدمزہ رہتی ہے اور ضعف کے آثار تمہارے بشرے سے ظاہر ہیں اور حکیم لوگ سڑے ہوئے پتوں کا عرق پلا پلا کر تمہاری جان مارنے

---

[1] اودھ پنچ، ۱۹ر فروری، ۱۹۷۸ء

کی فکر میں ہیں۔ اگر مجرد ضعف ہے تو اس قسم کے بے اصول علاج پر لعنت بھیجو، اور اپنے بھائی کے ذریعہ سے کسی انگریزی دوکان سے ایک بوتل پرانا عرق پورٹ وائن کی ایک نہایت مقوی دوا ہے منگالو، صبح کو ایک تولہ اور شام کو ایک تولہ پیا کرو پھر ہفتے میں چہرہ گلنار ہوجائے گا طاقت اور پھرتی آجائے گی اور خوب بھوک لگنے لگے گی۔''[1]

نئی روشنی کے فرزند کا پرانی روشنی کے پاپا کے نام خط ملاحظہ ہو:

''مائی ڈیر پاپا!

شاید حضور یہ مختصر مفید القاب اور اس کے نازک اور پیارے اور دلنواز معنی نہ سمجھیں اور مجھ سے خفا ہوں کہ کیوں میں نے مغلق اور پرشوکت الفاظ القاب میں استعمال نہ کیے اور کیوں ایک انگریزی الفاظ سے عریضہ شروع کیا لازم ہے کہ قبل مضامین ضروری کہ میں آپ کو اس کی کیفیت تصریحی لکھوں اس فقرے کے معنی پیارے ابا جان ہیں مگر انگریزی زبان کے سبب ان تینوں لفظوں کے اجتماع میں ایک عجیب خوشگوار مزہ پیدا ہوا ہے جو ساری قاموس اور صراح کے لکھنے سے بھی ممکن نہیں کیونکہ مصنوعی اور اصلی طور سے اظہار محبت میں باہم بڑا فرق ہے اور مشرقی السنہ کل مصنوعی ہیں۔ اس لیے ان کا اثر دل پر پورا پورا نہیں ہوتا..... تعلیم نسواں کے باب میں اگر آپ کے خیالات صاف نہ ہوں تو آپ حضور مجتہد عصر حضرت قبلہ و کعبہ مغربی کے حضور میں حاضر ہوں اور ان سے اس بارے میں صلاح کریں وہ بہمہ وجود آپ کا شک رفع کردیں گے اور آپ کے خیالات کی تاریکی روشنی سے مبدل ہوجائے گی..... میری رائے ہے کہ اگر حضرت قبلہ و کعبہ کی رائے ہو تو مغربی کالج میں میری بہنوں کو اللہ کا نام لے کر بڑے دن کے دن داخل کردیجئے پھر

---

[1] اودھ پنچ، مارچ ۱۹۷۸ء

دیکھئے کہ زمان تحصیل کے ختم ہونے پر کسی دو حوریں گھر میں آتی ہیں جن کی لیاقت اور سلیقہ اور نئی روشنی کی چمک سے بزرگوں کا نام روشن ہو جائے اور جن کی زیارت کو بزرگوں کی روح پرانے مقبرے سے ہمیشہ آیا کرے۔''[۱]

سید محمد آزاد کے دوسرے مضامین نے بھی کافی شہرت حاصل کی ان میں مہذب نامہ و پیام اور نئی ڈکشنری شامل ہے جس میں ظریفانہ انداز سے بعض تلمیحات کے معنی بتائے گئے ہیں اور اکثر اصلاحوں کی نئے رنگ سے تشریح کی گئی ہے۔ صرف مہذب بی بی پر تقریباً پانچ صفحات صرف کیے گئے ہیں اصطلاحات کی تشریح مصنف کی ذہانت کے ساتھ ہی اس کی باریک بینی پر بھی دال ہے ان تشریحات میں سماجی اور سیاسی پسماندگی اور مغرب کی کورانہ تقلید پر بہت ہی لطیف طنز ہے ملاحظہ ہو چودھویں صدی کی نئی روشنی کی ڈکشنری:

''اولڈ پاپا: الزام حرامزدگی کے سینہ فگار اور دلخراش تیر کے روکنے کی مضبوط اور محفوظ ڈھال، ابا جان کے لیے ایک شرعی اور قانونی آلہ بکار آمد قابل استعمال۔

ولایتی جی جی: دلکش، دل ربا اور دل فریب جڑی، میاں سے سن و سال میں دس بیس بڑی، حلقہ اغیار میں اکثر وقف جلوہ گری، لباس انسانی میں بے پر کی پری۔

نوچی: نائکا جی کے امید و بیم اور راز و نیاز کا تجارتی جہاز بڑی بی کے لنڈے اور سندے مرغ طمع کا نوخیز اور امید ریز اور پری وش پرواز۔

قرم ساق: نائکا جی کا وزیر، حیرت انگیز تعویذ تسخیر، رنڈیوں کا ظفر تکیہ اور بڑی بی کا گاؤ تکیہ۔''[۲]

ایک اقتباس نئے سال کی نئی روشنی کی ڈکشنری:

---

۱ اودھ پنچ، مارچ ۱۸۷۸ء

۲ اودھ پنچ، مارچ ۱۸۹۰ء

''آنر: مفہوم خیالی، جو خوش کرنے کے لیے۔

پارٹی فیلنگ: مرغ بے ہنگام کی طرح چلانا، غول بیابانی کا قائم مقام بن کر اپنے ہم قوموں کو راہ راست سے بہکانا۔

فیملی ایڈوکیشن: عام جلسوں میں اپنی بہو بیٹیوں کو لے جانا، اپنی میم کا ناچنے کے جلسے میں ایک وقت کے لیے دوسرے کی میم سے مبادلہ کرنا۔

سویلزیشن: اپنے ہم وطنوں کو نیم وحشی جاننا اپنے بزرگوں کو اولڈ گورنر کہنا۔

پارلیامنٹ: مدبروں کا آشیانہ، فصحاء اور بلغاء کی پرورش کا زچہ خانہ، زبانی لڑائی کا میدان، خیالی پلاؤ بیچنے والی کی دوکان، باہمی نفاق اور شک وحسد کا تنور، خیالی اور لسانی کشتی کا مہذب اکھاڑہ۔

یورپین: ظاہر میں شہد، باطن میں سم۔''[1]

''ہندوستانی بی بی'' میں ''ہندوستانی بی بی'' لفظ ہی کو مذاق نشانہ بنایا ہے۔

''اپنے شوہر کی عاشق، شیدا اور فدوائی، اپنے بچوں کی انا کھلائی اور دائی عفت کی دیوتا محبت کی تصویر، مروت کی اوتار، انسانی زندگی کی تازگی کے لیے جان نواز اور فرحت آثار ہوائے، بہار گھر کی رونق گھر کی زینت، گھر کا بھرم، عزیزوں اور متوسلین کے لیے ہمیشہ رواں، ہمیشہ شاداب، اور ہمیشہ لبریز چشمہ کرم، عصمت کے سراپا، عزت وحمیت گلستان کی ہزار داستان بلبل، سچی قناعت، اسلامیانہ صبر اور درویشانہ توکل کے صاف اور خوش رنگ بادہ گل رنگ کی مینا کی قلقل، خالص اور بے لوث دینداری کا محفوظ گنجینہ، عصمت عفت اور مروت کا قوی دفینہ..... وہ صحت بار نسیم عنبر شمیم جس کے چلنے سے

---

[1] اودھ پنچ، مارچ ۱۸۹۰ء

متعصب دشمنوں تک کی تنگ خیالی کا تیرہ تار زندان ہر ہندوستانی کے لیے روضہ رضوان ہے وہ مسیح الزمان جس کے شفا خانہ محبت و ہمدردی کی معجون کا محتاج ہر پیر و جوان ہے۔''[۱]

پوری تحریر میں ایک سبک رو چشمے کی سی روانی ہے جس میں قاری بہتے چلے جانے پر خود کو مجبور پاتا ہے۔

اودھ پنچ کے معاونین میں مولوی سید عبدالغفور شہباز بھی ہیں عبدالغفور شہباز کی نظم میں مزاح کے عناصر بدرجہ اتم موجود ہیں اور ''اودھ پنچ'' کے پہلے اور واحد شاعر ہیں جن کی نظمیں بے ساختہ مزاح سے سجی سنوری ہیں ان کے کلام میں شاعرانہ بلاغت، لطافت شعری یا ردیف و قافیہ کی برجستگی یا موزونی تلاش کرنا بے سود ہے انھوں نے اپنی روانی فکر اور جودت تخیل کو اصطلاحی پابندیوں پر خواہ مخواہ نہیں قربان کیا ہے۔ وہ مذہب و ملت کو بھی بسا اوقات نشانہ طنز بناتے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے گویا مذہب کی بعض سنگلاخی اقدار میں وہ لچک کے حامی تھے لیکن وہ بات کرتے وقت نہ صرف محتاط رہتے ہیں بلکہ بات کو ہلکے ہلکے مزاح سے ہم آہنگ کر کے کہ نشتریت میں قابل برداشت ملائمیت آجاتی ہے اور ردعمل کو تحریک نہیں ملتی، علاوہ ازیں شہباز کے کلام میں تفکر کا رنگ غالب ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں مزاح کے عناصر زیادہ ابھرنے نہیں پائے البتہ شہباز کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری میں مزاح کے عناصر زیادہ ابھرنے نہیں پائے۔ البتہ شہباز کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری کی ایک اہم خصوصیت یہ ضرور ہے کہ اس سے عامیانہ پن کی بو نہیں آتی۔ بلکہ اس میں ایک سنبھلی ہوئی کیفیت موجود رہتی ہے۔ ''قانون قسمت'' کے مندرجہ ذیل اشعار ان کے انداز نظر کی بہت اچھی وضاحت کرتے ہیں:

شب ہی کو ہے سدا چمکتا چاند
شب ہی کو جگمگاتے کوکب ہیں

---

۱ اودھ پنچ، مارچ ۱۸۹۰ء

کالی رنگت سے تل ہیں نقطہ زیب
جن سے روئے بتاں مزیب ہیں
زیب دیتا ہے تن پہ کالا سوٹ
متفق اس پہ کل مہذب ہیں
پاک کعبے کے کالے کالے غلاف
سرمہ چشم دین و مذہب ہیں
گوری رنگت ہے گر سبب اس کا
ہم میں بھی کالے کم نہیں سب ہیں
پتلیاں گر سپید ہوجائیں
ہر قدم پر قدم مذبذب ہیں
رشتہ مندوں میں خوں اگر ہو سپید
لاکھ اقرب ہوں پھر بھی عقرب ہیں
سچ بتا ان پہ کیوں تو ریجھی ہے
ہم سے غمزے ترے یہ کیوں اب ہیں
بولی قسمت فضول سب تقریر
ایسی باتیں نظر میں ہاں کب ہیں
کالے گورے پہ کچھ نہیں موقوف
دل کے آنے کے اور ہی ڈھب ہیں[1]

---

[1] اودھ پنچ، فروری ۱۹۰۰ء

طنز و مزاح کی ایک اور مثال مندرجہ ذیل ہے:

ایک مرغ نے یہ مرغی سے کہا
لوٹتی ہے خاک پر کیوں بے تمیز
ہنس کے مرغی نے دیا اس کو جواب
جسم پر ملتی ہوں پوڈر اے عزیز
بولا مرغا ہے یہ پوڈر کیا بلا
بولی مرغی ہے یہ ایک فیشن کی چیز

.....

پادری ولیم نے احمد سے کہا
لو پڑھو انجیل سے سیکھو تمیز
بولا احمد اس کی اب حاجت نہیں
پڑھ چکا ہوں میں تو صاحب سٹریز[1]

''حضرت رمضان کا فوٹو'' بھی اس خوبی سے محروم نہیں ہے۔ اس نظم میں شگفتگی کے ساتھ ساتھ طنز بھی اپنی پوری توانائی کے ساتھ جلوہ نما ہے:

دو ہفتہ سے گھر میں مرے وارد رمضان ہیں
جھلے پہ کچھ ایسے ہیں کہ سب ان سے بجال ہیں
ہے شام مہینوں ہی میں جاکر کہیں آتی
سنتے کہیں برسوں ہی مغرب کی اذاں ہیں

---

[1] ابن اسماعیل، اردو طنز و مزاح احتساب و انتخاب، ص: ۴۷

مسجد میں ہیں ترتیل و قرأت کے وہ جھگڑے
آمین کی جا مقتدی کہتے الاماں ہیں
ہوتی ہی نہیں ختم کسی طرح سے رکعت
مغرب پہ تراویح کے پاروں کے گماں ہیں
مغرب ہی چلی جاتی ہے مغرب سے عشا تک
سن لیتے کبھی اس میں ہی مرغوں کی اذاں ہیں
مسجد سے جو آئے تو پھرے گھر سے خدا کے
الفاظ ہیں جو شکر کے سب ورد زبان ہیں

مسلمانوں میں ''آثار اقبال'' نظم مندرجہ ذیل ہے:

اہل اسلام ہیں اب راہ پہ آئے جاتے
ہیں کچھ آثار سے اقبال کے پائے جاتے
ہنس تو دیتے ہیں نہ روئیں اثر غیرت سے
گر کبھی قوم کے خاکے ہیں اڑائے جاتے
دستخط چندوں کی فہرست پہ کردیتے ہیں
دے بھی دیتے ہیں بہت گر ہیں ستائے جاتے
شوق سے بیف، بٹن ہمرہ مسٹر بیکن
کھاتے سچ مچ ہیں جو جھوٹوں ہیں کھلائے جاتے
فانکوا سے بھی زیادہ نہیں ان کو انکار
کورٹ شپ کے ہیں اگر دام میں لائے جاتے

ر اٹھاتے ہیں وہ اکثر دلدالکلبوں کا
گر یتیموں پہ ہیں کچھ رحم دلائے جاتے[1]

مولوی عبدالغفور شہباز نظم میں اکبر سے قریب ہیں لیکن ان کے ہم سر نہیں ہیں خود کہا ہے ۔

شہباز ہے کلام کا اکبر کے یہ جواب
لیکن بڑا ہے فرق فروع واصول میں

اودھ پنچ کے معاونین میں منشی جوالا پرشاد برق کا نام بحیثیت مترجم خاص اہمیت رکھتا ہے ان کی شہرت کا سبب ان کے وہ تراجم ہیں جو انھوں نے انگریزی اور بنگالی زبان سے کیے ہیں۔ برق کو بنگالی زبان کے مشہور مصنف بنکم چندر چٹرجی سے خاص عقیدت تھی چنانچہ ان کے مشہور ناولوں کے ترجمہ انھوں نے اس قدر باسلیس اور بامحاورہ زبان میں کیے ہیں کہ اصل کا دھوکہ ہوتا ہے۔

''بنگالی دلہن'' ''رہنی'' ''پرتاپ'' اور ''مار آستین'' زبان کی صفائی سلاست اور روانی کے سبب موجودہ دور میں بھی دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں انگریزی زبان سے انھوں نے شکسپئر کے متعدد ڈراموں کا ترجمہ کیا ہے یہاں بھی انھوں نے ترجمہ کی مندرجہ بالا مخصوص خوبی کو پیش نظر رکھا ہے۔

برق کو بچپن ہی سے شاعری و مضمون نگاری کا شوق تھا۔ لکھنؤ کے زمانہ قیام میں ''اودھ پنچ'' حضرات کی صحبت نے شوق پر تازیانے کا کام کیا اور ان کی وہ تمام صلاحیتیں جن پر حالات زمانہ کے سبب گرد پڑ گئی تھی اودھ پنچ کی بدولت چمک اٹھیں، شاعری میں ان کی مختصر مختصر نظمیں اودھ پنچ کے صفحات میں شائع ہوتیں لیکن مثنوی ''بہار'' ان کی سب سے کامیاب اور اعلیٰ درجہ کی نظم ہے اس کے علاوہ ''معشوقہ فرنگ'' (رومیو جولیٹ کا منظوم ترجمہ) اور ''دکن کے قحط پر مرثیہ'' (ایک مرثیہ گو پر طنز) بھی نہایت دلچسپ ہیں۔

نثر نگاری میں جوالا پرشاد برق نے تراجم کے علاوہ سیاسی اور ملکی مسائل پر طنزیہ و مزاحیہ مضامین بھی

---

[1] رشید احمد صدیقی، طنزیات و مضحکات، ص:۱۳۲

لکھے ہیں جن میں ''البرٹ بل'' اور ''جوڈیشنل کمشنری اودھ'' کافی مشہور ہیں۔ حالاں کہ برق کی طرز تحریر میں کوئی ندرت نہیں وہ رتن ناتھ سرشار کے اسلوب تحریر سے بے حد متاثر تھے اور انھوں نے خود بھی اس روش پر چلنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے تاہم زبان نہایت صاف اور عمدہ ہے۔

ملاحظہ ہو ان کے مضمون ''البرٹ بل'' سے ایک اقتباس:

''لو سارا طلسم ٹوٹ گیا ایک چھلا وہ تھا جو چشم زدن میں نظروں سے اوجھل ہو گیا یکا یک بلائے آسمانی پھٹ پڑی۔ ایک اینٹ کی خاطر مسجد ڈھائی، پیار اہل ہاتھ سے گیا..... دشمنوں کی نظر کھا گئی سوتیلے ماں کی پالے پڑا ماں باپ ہاتھ مل کے رہ گئے۔ ہماری امیدوں کا خون ہو گیا۔ کلیجہ دھک سے ہوا، ان اینگلو انڈین سے خدا سمجھے، عین موسم بہار میں ہمارا آشیانہ نوچ کھسوٹ کے پھینک دیا، کمبخت کنکارڈٹ نے منحوس شکل دکھائی۔ سخن سازروں نے مکہ معظمہ کے پروکلیمیشن کے الفاظ میں نئے نئے معنی پہنائے۔ پیارے رپن کو مجبور کیا وہ بھی برے بھنسے کچھ کرتے دھرتے بن نہ پڑا۔ ممبران کانسل کے نقارخانے میں طوطی کی آواز کس نے سنی، آخرش وہ بھی انھیں کے ساتھ سر ہلانے لگے۔''[1]

نظم ''بہار'' میں انھوں نے خود کو زباندان ثابت کر دکھایا ہے اس طویل نظم میں منظر نگاری خوب کی ہے۔

اٹھلاتی لجاتی مسکراتی
کس ناز سے بہار آئی
کم سن الھڑ حسین انبیلی
چوتھی کی دولہن نئی نویلی

---

[1] اودھ پنچ، اگست ۱۸۹۸ء

بوٹا سا وہ قد بہار کے دن
اوٹھتی کونپل ابھار کے دن
گہنا پھولوں کا زیب تن کر
دھانی جوڑا نیا پہن کر[1]

اودھ پنچ کے لکھنے والوں میں احمد علی شوق واحد نثر نگار تھے جنھوں نے مزاح کو تمام رنگوں کے ساتھ اپنی نثر میں برتا۔ وہ طنز سے زیادہ کام نہیں لیتے مزاح مزاح میں ایسی بات کہہ جاتے ہیں کہ طنز اور مزاح دونوں کا سواد ملتا ہے۔ ان کے کلام میں زیادہ تر اودھ کی کھوکھلی معاشرت اور اس کے نام لیواؤں کی بعض مکروہ عادات پر بھرپور طنز ہے۔ بیشک انھوں نے مغربی میلانات کے بعض قابل اعتراض پہلوؤں کو بھی طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ احمد علی شوق نے اودھ پنچ کے صفحات میں چھوٹے چھوٹے مزاحیہ مضامین لکھے ہیں جس میں انھوں نے اپنے دور کے عام انحطاطی رجحانات کا مذاق اڑایا ہے۔ اگرچہ ان کے یہاں ظرافت کے پھول بوٹے ہر جگہ نہیں کھلتے، پھر بھی وہ جہاں کہیں نازک اصطلاحات منچلے محاورات اور شوخ الفاظ سے کام لیتے ہیں عبارت کو زعفران زار بنا دیتے ہیں۔ ''نمائش گاہ'' ''یہ تماشہ دیکھیے'' ''عشق کیا شے ہے کسی کامل سے پوچھا جائے'' اور ''خضر کو دیکھ کے کہتا ہے سبزہ خط یار'' ان کے ایسے دلچسپ مضامین ہیں جو نہ صرف صحت زبان اور صفائی کے لحاظ سے مشہور ہیں بلکہ طنز و ظرافت کے اعتبار سے بھی اعلیٰ درجہ کے ہیں۔

طنز و مزاح کی مثال میں ''عشق کیا ہے کسی کامل سے پوچھا جائے'' اس کی بڑی اچھی نظیر ہے۔ اس میں ''عشق کی دوسری قسم'' کی تعریف کیا خوب بیان کی ہے:

''قسم دوم (عشق بازاری) اس کے واسطے صرف چار ٹکے پیسوں کی ضرورت ہے۔ مٹھی میں دبا بازار کی سیدھیاں بھریں، ہانپتے کانپتے جا پہنچے، چڑیلیں نظر پڑیں، آنکھیں

---

[1] اودھ پنچ، اگست ۱۸۹۸ء

ملائیں، باتیں چکنائیں، دو چار جوتیاں، دس بیس گالیاں کھائیں، ٹکے حوالے کیے۔''[۱]

نمائش گاہ میں بھی طنز و مزاح کا کیا اچھا ملاپ نظر آتا ہے۔

''بارے خدا خدا کر کے وہ دن آیا لیجئے سویرے ہی سے نکھر، کنگھی سرے سے لیس ہو، جامدانی کا انگرکھ ڈانٹ، کریپ کی دوپلری نکہ دار ٹوپی ٹیڑھی رکھ، ٹاٹ بانی جوتا پہن، کڑی کمان کا سا تیر نمائش گاہ کے پھاٹک پر پہنچے، ابھی قدم ڈگنے نہیں پایا تھا کہ پہرے والوں نے ڈانٹ بنائی، الٰہی خیر، بھوچکے ہو رہے، زمین نے قدم پکڑے ہر چند آج کل کے خوشامدیوں سے کچھ بڑھ چڑھ کر خوشامد کی، وہ سب کے سب فرعون بے سامان ہوا کے گھوڑوں پر سوار کس کی سنتے ہیں لاچاری درجے مخالفت کا سبب پوچھا۔ میاں تم تو بسم اللہ کے گنبد کے رہنے والے معلوم ہوتے ہو، ذرا ہوش سنبھالو، عقل کے ناخن لو، پہلے آدمی بن جاؤ، پھر اس پھاٹک کے اندر قدم دھرنا۔

بھائی جان آدمی کیسے بنتے ہیں؟

ماشاء اللہ اتنے دنوں دلی میں رہے بھاڑ جھونکا کیے۔ اجی ٹوپی ایسی، کوٹ ایسا، پاجامہ ایسا، بوٹ ایسا۔''[۲]

اودھ پنچ کے ظرافت نگاروں میں احمد علی کسمنڈوی بھی اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے اودھ کی کھوکھلی معاشرت کو نشانہ طنز بنانے میں کامیابی حاصل کی۔ زبان شستہ اور پاکیزہ ہے، شوخی اور ظرافت بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ ان کا ایک اقتباس مندرجہ ذیل ہے:

''جنگجو ہونا ہم لوگوں کا شعار نہیں ہر چند وہ قوت رکھتے ہیں کہ ہوائے نفسانی اور

---

۱ اودھ پنچ، جون ۱۹۰۰ء

۲ اودھ پنچ، اپریل، ۱۹۰۰

خواہش شیطانی کبھی بھولے سے ہمارے پاس نہیں بھٹکنے پاتی۔عبادت میں ایسے کامل کے تمام شب بیداری ہی میں کاٹ دیتے ہیں، مستقل مزاج ایسے کہ حرکت کرنا جانتے ہی نہیں، پاؤں کا اٹپانا گویا پہاڑوں کا اٹھانا ہے، استغنا کی یہ کیفیت کہ باوجود استطاعت کے ہم کو بابا آدم کے وقت کے چٹائی اور وقیانوسی مداریئے حقے سے سروکار دنیائے فانی سے ایسے متنفر کہ چانڈو کو وسیلہ نجات سمجھ کر اسی کے دم سے کہ جو قطع ہستی کے واسطے تلوار کے دم سے کم نہیں سررشتہ حیات کے قطع کی بہ عجلت تمام تمنا کرتے ہیں، لڑائی جھگڑوں میں خون بہانے کا کیا ذکر اپنے عالم ہوش میں آلائش جسمانی کی شست وسو کے واسطے پانی کا بہانا بھی پسند نہیں کرتے۔نرم ایسے کے اگر اتفاقاً کبھی توپ کا ہولناک دھماکہ کانوں سے سن لیتے ہیں چونکہ اٹھتے ہیں اور کلیجہ ہاتھوں اچھلنے لگتا ہے اور اگر انصاف کیجئے تو چانڈو اور مدک کے چھرے ہم لوگوں کے واسطے کیا کم ہیں کہ جن کا مارا اٹھ کر پانی نہیں مانگتا۔''[1]

غرض یہ کہ اودھ پنچ کے معاونین کی شمولیت کے بغیر اردو طنز ومزاح کی کوئی بھی تاریخ ناقص رہے گی اور ان کی خدمات کا اعتراف کرنے اور جائزہ لینے کے لیے اودھ پنچ کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

---

۱ اودھ پنچ، فروری ۱۸۷۸ء

# حاصل مطالعہ

اردو ادب میں طنز وظرافت کی جو نئی شاہراہیں غالب نے نکالیں ان پر چند سال بعد ایک پورا قافلہ بڑی تیز روی سے گامزن ہوا جس کے میر کارواں منشی سجاد حسین تھے یوں تو ہر ادب کی طرح اردو ادب میں بھی ابتدا ہی سے کسی نہ کسی صورت میں طنز ومزاح کا وجود رہا ہے لیکن جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے اس کی حیثیت محض تاریخی ہے۔ باقاعدہ طور پر اردو ادب میں طنز ومزاح کا آغاز اودھ پنچ کے اجرا (۱۸۷۷ء) سے ہوتا ہے۔ اسی اخبار کے ساتھ طنز ومزاح نگاری کا عام رواج ہوگیا اور اس کے طفیل لکھنے والوں کی خاصی فوج تیار ہوگئی۔ باہمی مناقشوں نے اسے اور فروغ دیا۔ منشی سجاد حسین کی سرکردگی میں طنز وظرافت نگاروں کا ایک گروہ اپنی پوری صلاحیتوں کے ساتھ مجتمع ہوگیا جس نے زندگی کے ہر پہلو ہر گوشے پر طنز وظرافت کے پیرایہ میں بڑی سخت تنقید کی۔ سیاسی، سماجی، مذہبی، اخلاقی اور تعلیمی مسائل بہ الفاظ دیگر تہذیب کے تمام شعبوں پر ظریفانہ انداز میں اظہار خیال کیا۔ برخود غلط قسم کے سیاست دانوں کی غلطیوں اور خامیوں کا مذاق اڑایا۔ اپنی معاشرت کی خامیوں کو نمایاں کیا مذہبی بے راہ روی کو تمسخر کا نشانہ بنایا۔ اخلاقی اور تعلیمی معاملات میں مغرب کی کورانہ تقلید پر ملامت کی۔ غرض زندگی کی ہر ناموزوں اور بے ہنگم شے کو ہدف بنایا۔ اس میں شک نہیں کہ ''اودھ پنچ'' بعض اوقات حد اعتدال سے گزر جاتے اور ان کا لب ولہجہ بہت سخت ہوجاتا تھا لیکن یہ کہنا کہ جو طنز وظرافت اودھ پنچ کے مضامین میں ملتی ہے وہ ادبی معیار پر پوری نہیں اترتی یا وہ ناقص اور طفلانہ ہے، ناانصافی ہے۔ اگر ہم دنیا کی ہر زبان کے ادب میں طنزیہ ومزاحیہ رجحان کی تاریخ کا جائزہ لیں تو ہم اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتے کہ طنزیہ ومزاحیہ رجحان خصوصیت سے ملک کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی تغیر

وتبدل اور زبان کے ارتقا و عروج کے ساتھ وابستہ رہتا ہے نیز معاشرے میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ طنز وظرافت کا معیار بھی بدلتا رہتا ہے۔ یہ حقیقت تسلیم کر لینے کے بعد پھر ہم اردو ادب میں اودھ پنچ سے قبل کی مزاح نگاری پر ایک نظر ڈالیں اور اس ماحول و فضا کو مدنظر رکھیں جس میں اودھ پنچ کا اجرا ہوا اور ساتھ ہی اس کا بھی خیال رکھیں کہ اس زمانے میں اردو زبان ارتقا کی کونسی منزل پر تھی۔ ان واقعات و حالات کو دیکھتے ہوئے جن کے ماتحت اودھ پنچ عالم وجود میں آیا یہ حکم لگانا یقیناً قرین انصاف ہے کہ اودھ پنچ نے بحیثیت مجموعی اچھی اور ہر قسم کی طنز وظرافت کا نمونہ پیش کیا۔

ادبی و غیر ادبی بحث سے قطع نظر اگر اودھ پنچ کی طنز وظرافت کو دوسرے نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے تب بھی اس کی اہمیت تسلیم کرنا پڑتی ہے۔ اردو ادب کی تاریخ کے سرسری مطالعے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اودھ پنچ سے پہلے کا طنزیہ و مزاحیہ ادب فارسی سے متاثر ہی نہ تھا بلکہ طنز و مزاح کی بعض اصناف تو ہو بہو فارسی کی نقل تھیں لیکن اودھ پنچ نے پرانی روش سے ہٹ کر نئی روش کی داغ بیل ڈالی اور پہلی بار اردو ادب کو مغربی طنز و مزاح کا شعور بخشا۔ اس نے طنز و مزاح کے نئے نئے حربے اور نئے سلیقے دریافت کر کے طنزیہ و مزاحیہ ادب میں وسعت پیدا کر کے اسے ادب کا ایک وقیع حصہ بنا دیا۔

اودھ پنچ کا دور اپنے اندر بلا کی تبدیلیوں، شکست و ریخت اور جوڑ توڑ کو لیے ہوئے تھا ایک تہذیب کے زوال کے بعد دوسری تہذیب کے قدم جمانے کا آغاز اسی دور سے ہوا۔ چنانچہ اس دور کا ادب اور صحافت ایک آئینہ ہے جس میں ہم اس دور کی گہما گہمی کو دیکھ سکتے ہیں۔ خاص کر اودھ پنچ نے اپنے ماحول کی بھرپور ترجمانی کی۔ اپنے دور کے ماحول پر جو تبصرے لکھے گو اس کا انداز مزاحیہ تھا اور اکثر طنز کے تیر اس کے کمان سے نکلتے تھے لیکن اس کا مقصد وہی تھا جو ایک صحت مند ادب اور دیانتدار صحافت کا ہونا چاہیے۔

اودھ پنچ اپنے عہد کے تمام اخباروں سے مختلف اخبار تھا کیوں کہ تمام اخبار خبروں تک ہی محدود تھے ان میں نہ تو کوئی سیاسی بصیرت کا حامل تھا اور نہ کوئی اخبار اس وقت کے معاشرے، ماحول اور سوسائٹی کا

ترجمان تھا۔ لیکن اودھ پنچ نے سیاسی اور سماجی صورتحال، حکومت اور نئے نظام کی بے راہ روی اور دوسرے معائب کو طنز وظرافت کا نشانہ بنایا۔ اس نے مغربی تہذیب کو مخرب اخلاق قرار دیا اور جو لوگ مغربی تہذیب کی پذیرائی اور پرستش کررہے تھے ان کو قوم کا دشمن قرار دیا۔ اس نے ہندو مسلم اتحاد و اتفاق کو مستحکم بنانے کے لیے عملی قدم اٹھایا ایک دوسرے کے تہواروں، جلسوں اور خوشی وغم کے موقعوں پر ایک دوسرے کو شریک ہونے کے لیے ابھارا اور عوام کے دلوں میں محبت اور اخلاص کا جذبہ پیدا کیا۔ انگریزوں کی پالیسی پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کا اودھ پنچ نے ادبی مضامین کے ذریعہ رد کیا اور ہندو مسلم، ہندوستانی تہذیب اور بھائی چارے پر زور دیا اور مسلمانوں کو ہندوؤں کا ہمنوا قرار دیا۔ اودھ پنچ نے مسلمانوں کی اس حمایت کا پردہ ان لفظوں میں فاش کیا: آپ جانتے ہیں اندھا کیا چاہے دو آنکھیں، مسلمان بہت روتے چلاتے ہیں کہ ان کا بجز خدا کوئی پوچھنے والا نہیں، مگر اب معلوم ہوا اور معلوم کیا ہمارے جاننے والے لفٹنٹ گورنر بہادر چلتے چلاتے اعتراف بھی فرمایا کہ مسلمانوں کے احسانات مجھ پر ہیں ہمیشہ ان کا احسان مند رہا ہوں اور رہوں گا۔

اودھ پنچ کے اگر تمام معاونین کا ہم بحیثیت مجموعی تجزیہ کریں تو یہ بات وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ تمام مسافر ایک ہی کارواں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان سب کی منزل اور مقصد ایک ہے اور ایک حد تک اپنے اس مقصد میں کامیاب بھی ہوئے جس کے لیے عزم سفر کیا تھا۔ یہ کارواں مغرب پرستی کے بڑھتے ہوئے سیلاب کی روانی میں رکاوٹیں ڈالنے کی انتہائی کوشش کی اور بہت حد تک اس کے جوش وخروش میں دھیما پن پیدا کیا تھا۔

اودھ پنچ کے روح رواں وایڈیٹر منشی سجاد حسین نے اپنے ۳۵ سالہ دور صحافت میں ہزاروں کی تعداد میں مضامین لکھے ان میں وہ مضامین جو خالص سیاسی مسائل، سماجی معاملات پر مضامین، ادبی اور تنقیدی مضامین اور وہ مختصر مضامین جو فکاہی کالم کے تحت لوکل علیہ الرحمۃ، نوٹس، تار برقیاں، چہ میگوئیاں اور موافقت زمانے کے عنوان سے شائع ہوئے ہیں۔ منشی سجاد حسین کے تمام مضامین میں طنز وظرافت کا ایسی مشترکہ

ڈوری بندھی ہوئی ہے جو ایک لحاظ سے ان میں باہم مطابقت اور وحدت پیدا کرتی ہے خواہ وہ مضامین سیاسی ہوں یا سماجی، ادبی ہوں یا تنقیدی، سجاد حسین کی شوخ و طرار طبیعت ان میں طنز اور ظرافت کا عنصر شامل کر دیتی ہے۔

منشی سجاد حسین کے سیاسی مسائل پر لکھے ہوئے تمام مضامین اسی سیاسی رجحان کی غمازی کرتے ہیں جو اودھ پنچ کی آزادانہ اور مقرر پالیسی تھی۔ لہٰذا جہاں تک منشی سجاد حسین کے سیاسی نظریات کا تعلق ہے وہ ابتدا ہی سے انگریزی حکومت کو ہندوستانی عوام کے حق میں دشمن تصور کرتے تھے۔ اور ابن الوقت نوابین راجاؤں اور روساء کو بھی انگریزی حکام کی طرح ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھتے تھے وہ عوام کے سچے ہمدرد اور مخلص دوست، تعصب اور تنگ نظری سے کوسوں دور، ہندو اور مسلم اتحاد کے زبردست حامی، الحاق اودھ، انکم ٹیکس اور البرٹ بل کے سخت مخالف تھے۔

منشی سجاد حسین نظام معاشرت میں سخت قدامت پرست واقع ہوئے تھے، وہ مذہبی اور قومی رسم و رواج کو دیرینہ شکل میں دیکھنے کے خواہش مند تھے اور ان میں کسی اصلاح کے قائل نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کی سیاسی، سماجی اور مذہبی اصلاح کے لیے قدم اٹھایا تو سجاد حسین نے اس کی سخت مخالفت کی۔ چونکہ مذہبیت اور اپنی تہذیب و تمدن سے شدید محبت سجاد حسین کی نس نس میں پیوست تھی لہٰذا وہ سرسید اور ان کے ہمنواؤں کی مغرب پرستی کو برداشت نہ کر سکے انھوں نے اس کی کھل کر اور ڈٹ کر اتنی شدومد سے مخالفت کی کہ بعض اوقات صحافت اور مزاح نگاری کے تمام اصولوں کو بالائے طاق رکھ دیا۔

ادبی اور تنقیدی مضامین سے متعلق منشی سجاد حسین کے جو مضامین اودھ پنچ میں شائع ہوئے ہیں وہ کئی لحاظ سے اہم ہیں، اولاً یہ مضامین قومی اور مذہبی تعصب سے بالکل پاک صاف ہیں ثانیاً بے جا غیظ و غضب اور بغض و حسد کے جذبات سے مبرا ہیں۔ انھوں نے بڑے ہی شائستہ انداز میں اپنے مخالفین کا جواب دیا ہے کہیں بھی اپنے مخالفین کے لیے ایسے الفاظ استعمال نہیں کرتے جو ذوق سلیم پر گراں ہوں۔

منشی سجاد حسین کے علاوہ اودھ پنچ کے قلمی معاونین میں اکبرالہ آبادی، پنڈت رتن ناتھ سرشار، مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، پنڈت تربھون ناتھ ہجر، نواب سید محمد آزاد، مولوی سید عبدالغفور شہباز، منشی جوالا پرشاد برق، منشی احمد علی شوق، مولوی احمد علی کسمنڈوی وغیرہ نے نظم ونثر کے ذریعے سیاسی، سماجی، ملکی، مذہبی غرض تہذیبی زندگی کے ہر پہلو اور ہر گوشے کو ہدف طنز بنایا۔ ان میں اکبرالہ آبادی، پنڈت رتن ناتھ سرشار، پنڈت تربھون ناتھ ہجر اور نواب سید محمد آزاد کے حوالے سے چند جملے پیش ہیں۔ اکبر کی شاعری کی ابتدا سنجیدہ کلام سے ہوئی لیکن اودھ پنچ سے وابستہ ہوجانے کے بعد اکبر نے اردو ادب میں طنزیہ اور مزاحیہ شاعری کی بنیاد ڈالی۔ اکبر مشرقیت کے دلدادہ اور مغرب سے سخت متنفر اور بیزار ہیں، وہ باطن کو ظاہر پر فوقیت دیتے ہیں وہ مغرب کی مادیت کو مذہب اور اخلاق کا دشمن سمجھتے ہیں۔ انھوں نے نہ صرف مغربی تہذیب وتمدن کے خلاف آواز بلند کی بلکہ ہر اس چیز کی مذمت کی جس کا مغرب سے ذرا سا بھی تعلق ہو۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار نے بھی نوابی لکھنؤ اور اس کی سوسائٹی کی تصویریں اپنے قلم سے ظریفانہ انداز میں ہو بہو کھینچ کر ادب میں بلند مقام حاصل کیا۔ سرشار کی تصویروں میں لکھنؤ ہر انداز اور ہر پہلو سے جلوہ گر ہے جس میں ہمیں ہر رنگ اور ہر قسم کی تصویریں ملتی ہیں۔ نواب ورؤسا کی عیش پروری، پیروں اور بزرگوں کی مکاری، محرم، ہولی، عرس غرض لکھنؤ کے آخری تمدن اور سوسائٹی کی مکمل تکمیل سرشار نے پوری جزئیات کے ساتھ پیش کی ہیں۔ فسانہ آزاد میں سرشار نے ایک لٹی ہوئی تہذیب ایک اجڑی ہوئی معاشرت اور ایک زنگ آلود تمدن کا نقشہ کھینچا ہے۔ اس افسانہ میں وہ سب موجود ہے جو سرشار نے اپنی آنکھوں سے دیکھا جو سنا اور جسے ان کے دل و دماغ نے محسوس کیا۔ لہٰذا پورا لکھنؤ اس افسانہ میں متحرک نظر آتا ہے۔

پنڈت تربھون ناتھ ہجر نے غزلیں کہی ہیں، لیکن وہ غزل گو نہیں، انھیں مسدس کے رنگ سے خاص انسیت تھی لیکن بعد میں اودھ پنچ کی وابستگی سے ان کی نظموں میں طنز وظرافت کا نمایاں رنگ جھلکنے لگا تھا۔ لسان الغیب، نوحہ کشمیر ان کی کامیاب نظمیں ہیں لیکن شاعری میں ان کی شہرت ان نظموں کے علاوہ ان

تحریفوں کے سبب ہے جو مغربی پیروڈی کی شکل میں لکھی گئی ہیں۔

اس کے علاوہ نواب آزاد نے بھی اپنے ہم عصروں کی طرح مغربی تہذیب کے ساتھ ساتھ اپنی تہذیب کو بھی اپنے مخصوص انداز میں ہدف طنز بنایا ہے۔ اس سلسلے میں ان کے وہ فرضی خطوط جو انھوں نے انگلینڈ سے بھیجے ہیں اودھ پنچ میں ''پرانی روشنی کا نامہ و پیام'' کے عنوان سے شائع ہوئے ہیں۔ ان کا مشہور ڈرامہ ''نوابی دربار'' جو اودھ پنچ میں قسط وار چھپتا رہا اور بعد میں کتابی صورت میں شائع ہوا طنز کا اعلیٰ نمونہ ہے جس میں انھوں نے ایک طرف کاہل مشرقی نوابوں کا خاکہ اڑایا ہے تو دوسری طرف مسٹر جیمس کو مغرب کا ایک نمائندہ بنا کر مزاح و تمسخر کا نشانہ بنایا ہے۔ مغرب اور مغربیت کے خلاف نواب آزاد نے جس معقول اور دلنشین پیرائے میں طنز کیا ہے اس کا جواب بحیثیت مجموعی اردو ادب میں ملنا دشوار ہے۔

آزاد کی طنز و ظرافت میں جو چیز نمایاں اور بامزہ ہے وہ ان کی خلقی شگفتگی ہے، کینہ پروری اور زہرناکی کا عنصر کہیں نمایاں نہیں ہے۔ شاید اسی اعتبار سے ان کو اردو ادب کا ہورلیس اور چاسر کہا جاتا ہے۔

غرض یہ کہ اودھ پنچ نے طنز و ظرافت کے پیرائے میں سیاسی و سماجی اور تہذیبی کشمکش کو بڑی خوبی سے پیش کیا۔ مغربیت کے خلاف کھل کر آواز بلند کی اور لوگوں کو مغربی تہذیب و تعلیم، طور و طریقہ سے دور رہنے کی تلقین کی اور مشرقی کلچر اپنائے رکھنے پر لوگوں کو اکسایا تاکہ سماج میں توازن برقرار رہ سکے۔

# کتابیات


اقبال اختر، اردو نثر میں ظرافت، ناشر قمر آزاد، اردو لائبریری پٹنہ، ۱۹۸۶ء

احمد جمال پاشا، ظرافت اور تنقید، مطبع نشاط پریس، ٹانڈہ، ۱۹۸۲ء

ابن اسماعیل، مولف و مرتب، اردو طنز و مزاح احتساب و انتخاب، گلشن پبلشرز، سری نگر، ۱۹۸۸ء

مصباح الحسن قیصر، اردو طنز و ظرافت اور منشی سجاد حسین، یونائیٹڈ پریس، لکھنؤ، ۱۹۷۸ء

ڈاکٹر وزیر آغا، اردو ادب میں طنز و مزاح، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۰ء

پروفیسر رشید احمد صدیقی، طنزیات مضحکات، پبلشرز مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۷۳ء

محمد عبدالرزاق فاروقی، اودھ پنچ کی ادبی خدمات، پبلشر شاہین کلب کرنول، ۱۹۸۲ء

نورالحسن ہاشمی، دلی کا دبستان شاعری، ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ، ۱۹۷۱ء

ابواللیث صدیقی، لکھنؤ کا دبستان شاعری، اردو پبلشرز، لکھنؤ، ۱۹۷۳ء

مرتبہ احتشام حسین، ادب پارے، ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ، ۱۹۵۹ء

غلام احمد فرقت کاکوری، اردو ادب میں طنز و مزاح، سرفراز قومی پریس، لکھنؤ، ۱۹۵۷ء

امیر حسن نورانی، مرتبہ، اردو کے ادبی معرکے سودا کے عہد سے چکبست و شرر تک، مصنف، لکھنؤ، ۱۹۶۹ء

پروفیسر آل احمد سرور، تنقیدی اشارے، ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ، ۱۹۵۵ء

محمد زاہد، اکبر کی طنزیہ اور ظریفانہ شاعری، مصنف، علی گڑھ، ۱۹۷۹ء

برج نرائن چکبست، مضامین چکبست، انڈین پریس، الٰہ آباد، ۱۹۲۸ء

محمد عبدالرزاق فاروقی، اودھ پنچ اور اکبر الہ آبادی، یونائیٹڈ پریس، کرنول، ۱۹۸۲ء

محمد عبدالرزاق فاروقی، داغ اور اودھ پنچ کے ادبی معرکے، یونائیٹڈ پریس، کرنول، ۱۹۸۲ء

احمد جمال پاشا، اودھ پنچ دور سوئم، سرفراز قومی پریس، لکھنؤ ۱۹۷۵ء

کشن پرشاد کول، ادبی وقومی تذکرے، جلد دوم، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، ۱۹۵۵ء

عابد رضا بیدار، ''اودھ پنچ ۱۹ویں صدی میں'' علی گڑھ اردو ادب میگزین، ۱۹۶۳ء

سید مصباح الحسن قیصر، معاونین اودھ پنچ، یونائیٹڈ پریس، لکھنؤ، ۱۹۸۰ء

محمد طاہر، مشتاق احمد یوسفی کی ادبی خدمات، ابوذر پریس، اعظم گڑھ، ۲۰۰۳ء

کشن پرشاد کول، مرتبہ، گلدستہ پنچ، نول کشور پریس، لکھنؤ۔ ۱۹۱۵ء

کلیات اکبر الہ آباد، حصہ دوم سوم مطبوعہ یونین پرنٹنگ پریس، دہلی۔ ۱۹۶۷ء

نسیم قریشی، مرتبہ، علی گڑھ تحریک، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، علی گڑھ۔ ۱۹۸۶ء

مصنف: تاراچند، اہل ہند کی مختصر تاریخ، ۱۹۶۸ء

رضی کاظمی، مرتبہ، انتخاب اودھ پنچ، کتابی دنیا، لکھنؤ۔ ۱۹۷۸ء

# رسائل


علی گڑھ کالج میگزین ۱۹۵۰ء

ماہنامہ شاہراہ دہلی، طنز و مزاح نمبر ۱۹۶۳ء

نقوش طنز و مزاح نمبر، لاہور، فروری ۱۹۵۹ء

ساقی طنز و ظرافت نمبر، ۱۹۴۵ء،

ہم سخن طنز و مزاح نمبر، جناح کالج کراچی، ۸۲-۱۹۸۱ء

علی گڑھ میگزین طنز و ظرافت نمبر، مارچ ۱۹۴۴ء

ادیب خصوصی شمارہ، علی گڑھ ۱۹۹۳ء

رسالہ فروغ اردو، لکھنؤ، جون: ۱۹۶۰ء

رسالہ اردو جلد: ۱۵، اپریل ۱۹۳۵ء،

علی گڑھ میگزین، اکبر نمبر، ۱۹۵۰ء

نقوش شخصیات نمبر، ۱۹۵۶ء

اردو اپریل، ۱۹۲۳ء

# اودھ پنچ کی فائلیں

اودھ پنچ ۱۹ر فروری ۱۸۷۸ء، نہرو میموریل لائبریری، نئی دہلی۔

اودھ پنچ ۱۳ر مئی ۱۸۸۴ء، رضا لائبریری رامپور

اودھ پنچ ۲۱ر فروری ۱۸۸۶ء، رضا لائبریری رامپور

اودھ پنچ ۲۱ر مارچ ۱۸۸۸ء، رضا لائبریری رامپور

اودھ پنچ ۱۸ر اگست ۱۸۸۸ء رضا لائبریری رامپور

ودھ پنچ ۳۰ر اگست ۱۸۸۸ء رضا لائبریری رامپور

اودھ پنچ، مارچ ۱۸۹۰ء جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

اودھ پنچ ۵ر نومبر ۱۸۹۱ء جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

اودھ پنچ ۱۲ر فروری ۱۸۹۲ء جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

اودھ پنچ ۷ر اگست ۱۸۹۲ء جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

اودھ پنچ ۲۵ر جولائی ۱۸۹۵ء رضا لائبریری رامپور

اودھ پنچ ۷ر اگست، ۱۸۹۶ء، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

اودھ پنچ اگست ۱۸۹۸ء، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

اودھ پنچ ۳۰ر نومبر ۱۸۹۹ء، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

اودھ پنچ فروری ۱۹۰۰ء، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

اودھ پنچ ۱۰ر اکتوبر ۱۹۰۱ء، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

اودھ پنچ ۸ر مئی ۱۹۰۲ء، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

اودھ پنچ ۱۱ر مئی ۱۹۰۵ء، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

اودھ پنچ ۱۱ر مئی ۱۹۰۵ء، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

اودھ پنچ ۱۰ر اگست ۱۹۰۵ء، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

Jawaharlal Nehru University
Library

# UNNISVI SADI KE AWAKHIR MEIN TAHZIBI KASHMAKASH AWADH PANCH KE HAWALE SE

Dissertation submitted to the Jawaharlal Nehru University
in partial fulfilment of the requirement
for the award of the degree of

MASTER OF PHILOSOPHY

*by*

JAMAL AHMAD

*under the supervision of*

DR. MAZHAR HUSSAIN
(MAZHAR MEHDI)

Centre of Indian Languages
School of Languages, Literature and Culture Studies
Jawaharlal Nehru University
New Delhi - 110067

2003